

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188335

UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No. ۹۲۸، ۱۷

Accession No.

Author

۲-ک

کتاب مصطفیٰ

۷. 304

۳۰۲

Title

مکتب محمد جالس -

This book should be returned on or before the date last mark

مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۱۶۹

اب محمد حاسی

سید کلب مصطفیٰ (بی۔ اے)

شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)، دہلی

قیمت

۱۹۴۷ء

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند)

ملک محمد جاویدی

از

سید کلبِ مصطفیٰ (بی۔ اے)

شائع کردہ

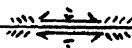
انجمن ترقی اُردو (ہند)، دہلی

۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
(۱)	تعارف	۱
(۲)	ماخذ کی تلاش	۵
(۳)	حالات زندگی	۱۱
	ضمنی عنوانات	۱۳
	عہد ملک محمد جاسسی میں ہندوستان کی فضا، ملک محمد کا مولد و کن، خاندان، حلیہ، خطاب، لقب، ذریعہ معاش، اولاد، احباب، مذہب، اعتقادات مذہبی، ارادت یا شرف، شاہ مبارک بودہ، درگاہ تصوف، اجازت تصوف، میٹھی کوروانگی، علمی استعداد، فارسی، فارسی ضرب الامثال، عربی، سنسکرت، بھاشا اور سنسکرت، عروض، دیدانت اور پران، رایان اور مہا بھارت، جغرافیہ، تاریخ، نجوم، عام معلومات، اخلاق و عادات، بدیہہ گوئی، خصالیں، جرأت، انکسار، مصیبت، بُرائی کے بدلے بھلائی، جوان مردی، دولت، وفات، مزار، ملک محمد کا مرتبہ ہندی ادب میں،	
(۴)	تصانیف	۸۱
	ذیلی عنوانات	۸۲
	پداوت، پداوت کا قصہ، کہانی کا تاریخی رُخ، شاعر جاسسی کا نظر پر محبت،	

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
	فراق، وصال، پدماوت کا مرتبہ ہندی ادب میں، پدماوت پر ایک سرسری نظر، سیرت نگاری، پدماوتی، رتن سین، ناگمتی، رتن سین اور بادل کی مائیں، بادل کی بیوی، راگھو، گورا اور بادل، علاء الدین، وصف نگاری، رسم و رواج، فنی خصوصیات، تشبیہ، حسن تعلیل، مبالغہ، تخیل اور روانی، محاورہ، مقولہ، ضرب الامثال، حکمت و موغظت، اکھراوٹ، اکھراوٹ کا کلام، آخری کلام، پوستی نامہ، متفرق اشعار	
۱۷۳	بارہ ماسہ	(۵)
۱۸۰	شاعر جاتسی کی بھاکا	(۶)
۱۸۱	ضمنی عنوانات	
	اودھی زبان کی تاریخ، اودھی زبان کی خصوصیات، برج بھاشا شاعری کی خصوصیات، سن تصنیف، سن تصنیف پر محاکمہ، رسم الخط	
۱۹۹	سراپا	(۷)
۲۰۵	جاتس	(۸)





ملک محمد جالسی

[شمس العلماء پروفیسر عبدالغنی بی انگریزی تصنیف «دربار مغلیہ میں فارسی ادب کی تاریخ» سے بہ اجازت مصنف نقل لی گئی]

”تعارف“

ملک محمد جانیسی اودھ کے رہنے والے اور بھاشا کے بڑے پاکمال شاعر تھے۔ اُن کا نام آج کئی صدیوں کے بعد بھی اور تو اور اُن کے اہل وطن تک عزت اور فخر کے ساتھ لیتے ہیں اُن کی تصانیف کے اتنے مختلف نسخے اور ترجمے ہندستان کے متعدد مطابع سے شائع ہوئے ہیں، جو یقیناً کسی ملک اور زبان کے شاعر کی شہرت کو چار چاند لگانے کے لیے کافی ہیں (چہ جائیکہ جب سوال ہو ہندستان جیسے قدناشناس ملک اور بھاشا جیسی مُردہ زبان کے چار سو برس پُرانے شاعر کا — قلمی نسخے اس کے علاوہ ہیں) ملک محمد کی ایک تصنیف یعنی پدماوت کے کئی نسخے ناگری رسم الخط میں ملتے ہیں جن میں سے بعض حواشی اور بین السطور معانی سے مزین ہیں اور بعض میں اُن کے حالات زندگی بھی مجملًا موجود ہیں اور اُن کے کلام پر نقد و تبصرہ بھی ہے۔

فارسی زبان میں ملک صاحب کے متعلق کچھ اذکار ہیں۔ اراکان کے راجا کی سرپرستی میں پدماوت کے ایک نسخے کا سترھویں صدی عیسوی میں بنگالی زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

(انگریزی زبان میں بھی چند مضامین اور ڈاکٹر گری یرسن اور سدھا کر جی کامرٹب کیا ہوا دیدہ زیب لیکن نامکمل اپڈیشن یعنی

سدھا کر چند ریکاٹ موجود ہی ہے

اُردو زبان میں بھی اصل نظم کے متعدد نسخے کانپور، لکھنؤ، بریلی کے مختلف مطابع کے ہیں جو قریب قریب سو برس پڑانے ہیں۔ کسی میں کل نظم کا ترجمہ اُردو نظم میں ہے، کسی میں متن کے نیچے مطلب نشر میں لکھ دیا ہے، کسی میں محض حواشی ہی پر اکتفا کی ہے۔ البتہ خود ملک صاحب کے متعلق کوئی معلومات اُردو زبان میں نہیں ہے سوائے ان چند سطروں کے جو آبجیات میں مولانا آزاد دہلوی نے سپرد قلم فرماتی ہیں۔ یا اس ضمنی تذکرے کے جو حضرت شبلی نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ جس کا عنوان

۱۔ ”مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے چنانچہ سولہویں صدی عیسوی شیرشاہی عہد میں ملک محمد جاسی ایک شاعر ہوا ہے اس نے پداوت کی داستان نظم کی اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اس کی بھر بھی ہندی رکھی ہے اور ورق کے درق اُلٹتے جاؤ فارسی عربی کا لفظ نہیں تا مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اور ہر جگہ مل سکتی ہے اس لیے نوٹ نہیں لکھتا“

ماخوذ از آبجیات صفحہ ۱۸ مطبوعہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور

کی دروازہ طبع نہم ۱۹۱۷ء

۲۔ ”امیر خسرو کے بعد شیرشاہی عہد میں ملک محمد جاسی پیدا ہوئے وہ بھاکا زبان کے ایسے زبردست شاعر تھے کہ خود ہندوؤں میں آج تک ان کا ہمسرہ پیدا نہیں ہوا۔ پداوت ان کی ثنوی آج موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوؤں میں بقیہ حاشیہ صفحہ ۳ پر ملاحظہ کیجیے

”مسلمان اور ہندی شاعری“ ہے۔ اس کے علاوہ میر حسن دہلوی نے بھی

سب سے بڑا شاعر آخر زمانے کا لیداس (تسی داس) گزرا ہو جس نے راماین کا بھاکا میں ترجمہ کیا ہے۔ نکتہ شناسوں کا بیان ہے کہ قدرت زبان کے لحاظ سے پداوت کسی طرح راماین سے کم نہیں اور اس قدر تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ پداوت کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاؤ۔ عربی فارسی کے الفاظ مطلق نہیں آتے اور یوں شاذ و نادر تو راماین بھی ایسے الفاظ سے خالی نہیں۔

ملک محمد جاسی نے پداوت کے سوا بھاکا میں اور بھی دو مثنویاں لکھی ہیں جو ان کے خاندان میں اب بھی موجود ہیں لیکن افسوس ان کے چھپنے کی نوبت نہیں آتی۔

(مقالات شبلی حصہ اول صفحہ ۱۹-۲۰ مطبوعہ آسی پریس محمود نگر لکھنؤ)
نوٹ۔ مقالات شبلی جلد دوم مطبوعہ دارالمصنفین ۱۳۳۷ء میں بھی صفحہ ۸۱ پر ملک محمد جاسی کے متعلق یہی مضمون ہے ایک مضمون ملک محمد جاسی کے متعلق رسالہ ”تماہی“ ہندستانی اکیڈمی الہ آباد بابت ماہ اکتوبر ۱۳۳۷ء میں نور الحسن صاحب کاکوروی کا ہے جو ”ہندی زبان اور مسلمانوں کا طبعی میلان“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے مضمون طویل ہے مگر نفس معاملہ کے متعلق اقتباس حسب ذیل ہے۔

”ملک محمد جاسی نے حضرت امیر خسرو کے بعد شیر شاہی دور میں آنکھیں

کھولیں۔ صاحب پداوت کی شہرت ہندی ادب میں مسلم ہو ۱۵۴۷ء میں مثنوی پداوت تصنیف کی۔ جو اب بھی موجود ہے اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہے۔

نکتہ شناسوں کا دعویٰ ہے کہ قدرت زبان اور سادگی بیان کے لحاظ سے بقیہ حاشیہ صفحہ ۴ پر ملاحظہ کیجیے

چند اشعار ملک محمد جاسی کی شان میں ارشاد فرمائے ہیں۔

ثنوی پداوت کسی طرح رامین سے کم نہیں ہو ملک صاحب موصوف کبیر کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ راجہ صاحب اہیٹھی ان کی بہت آؤ بھگت کرتے تھے۔ اہیٹھی میں ان کا مزار مرجع خلائی ہو۔

پداوت کے سوا دو کتابیں اکھراڈ اور دوسری کا نام معلوم نہیں بھاکا زبان میں لکھی ہیں جن کے زیور طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اسوس ہو کہ کلام بے حسّی زمانہ سے مفقود ہو اکثر مقامات پر تلاش کی گئی نہ مل سکا۔

صفحہ ۳۸۲ - ۳۸۳

تھے ملک نامے محمد جاسی	وہ کہ پداوت جنھوں نے ہو لکھی
مرد عارف تھے وہ اور صاحب کمال	ان کا اکبر نے کیا دریافت حال
ہو کے مشتاق اُن کو بلوایا شتاب	تاکہ ہو صحبت سے اُن کی فیضیاب
صاحب باطن تھے وہ مست المست	لیک دنیا تو یہ ہو ظاہر پرست
تھے بہت بد شکل اور وہ بد قوی	دیکھتے ہی اُن کو اکبر ہنس پڑا
جو ہنسا وہ تو انھوں نے دیکھ کر	یوں کہا اکبر سے ہو کر چشم تر
ہنس پڑے مائی بہ تم ای شہریار	یا کہ میرے پر ہنسے بے اختیار
کچھ گنہ میلا نہیں ای بادشاہ	سرخ باسن تو ہوا اور میں سیاہ
اصل میں مائی تو ہو سب ایک ذات	اختیار اس کا ہو جو ہو اس کے ہاتھ
گرمی دہی کے رنگ کوئی رات کے	رنگ ہیں دونوں یہ اُس کے ہت کے
رویا داد گر	گر پڑا اُن کے قدم پر آن کر
	بقیہ حاشیہ صفحہ ۵ پر ملاحظہ کیجیے۔

”ماخذ کی تلاش“

ملک محمد جاسی کے حالات فراہم کرنے اور اُن کے کلام کو اُردو میں منتقل کرنے کا خیال میرے دل میں اُس وقت سے ہو جب میں راءِ تالیف

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴

الغرض ان کو باعزاز تمام اُن کے گھر بھجوا دیا پھر والسلام
صاحب تاثیر جو ہیں اے حسن دل پہ کرتا ہو اثر ان کا سخن

(ماخوذ از رموز الحارثین مصنفہ میر حسن دہلوی ۱۸۸۷ء)

نوٹ۔ یہ مثنوی ۱۳۵۲ھ میں شمس الاسلام پریس سے طبع ہو چکی ہو اور کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں موجود ہو۔ اسی کی کو محسوس کر کے ملک صاحب کے حالات زندگی ان چند صفحات میں محفوظ کیے جاتے ہیں اگرچہ چند صفحے ملک محمد جاسی کے کلام پر تبصرے اور اُن کی زندگی کے حالات کی تشریح کے لیے تو کیا اُن کو دنیا سے ادب سے روشناس کرنے کے لیے بھی ناکافی ہیں۔ اللہ رے زلمے کی نیرنگی کہ جس نے اقلیم سخن پر حکومت کی ہو آج اُسے اہل سخن سے متعارف کرنے کی ضرورت پیش آتی ہو لیکن جو کچھ لکھا جا رہا ہو وہ محض تہمید کے طور پر ہو اور اس لیے کہ شاید سمندا ز کے لیے تازیانہ ہو سکے ورنہ کسی شاعر اور ادیب کے کارناموں اور حالات زندگی کے بیان مختصر کے لیے بھی ایک طویل دفتر درکار ہو۔ خاص کر محمد جاسی کے لیے جن کو دوسروں کے مذہب کی روایتوں اور اُن کی زبان پر اتنا قابو تھا کہ پداوت ایسی داستان نظم کی جسے دیکھ کر

آج بیسویں صدی کے ادیب اور شاعر بھی انگشت بندن رہ جائیں۔

سید کلب مصطفیٰ

جائے۔ جنوری ۱۳۵۶ء

و تصنیف کی صعوبتوں سے بالکل بے خبر تھا اور وہ دشواریاں تو میرے وہم میں بھی نہ گزری تھیں جو اس مرحلہ خاص کے لیے مخصوص تھیں۔ لیکن ابتدا کر دینے اور ان وقتوں کے ایک حد تک پیش آجانے کے بعد میرے ارادوں میں اور زیادہ کجنگی پیدا ہو چلی اور خیال ہوا کہ اگر مشکلات کے ساتھ ہمت بھی بڑھتی گئی تو کچھ دور نہیں کہ میرا مدعا حاصل ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی تقویت پہنچاتا رہا کہ تلاش ہو تو دارِ امکان میں کیا نہیں مل جاتا۔

لیکن باایں ہمت کوئی مسالا اکٹھا نہ ہو سکا۔ جہاں جہاں سے اُمید تھی وہاں سے بھی میرے ہر استفسار کا جواب غدر لا علمی میں دیا گیا۔ ہر سعی ناکام ہوتی۔ غرض حوصلے پست ہو گئے جی چھوٹ گیا اور اس تاریکی میں راہروی، دوسروں کا کیا ذکر ہے، خود میرے نزدیک بھی شیخ چلی کے منصوبے سے کچھ زائد نہ معلوم ہوتی۔ بس میں ہمت ہار کر بیٹھنے والا ہی تھا کہ ایک کرم فرما کی مہربانی سے رام چند شکل کی ”جاسی گرنٹھاولی“ ہاتھ لگی جس میں ملک صاحب کے حالات کے ساتھ ساتھ اُن کی دو کتابیں ”پدماوت اور اکھراٹ“ بھی تھیں۔ مُردہ امید میں جان آگئی گویا اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں اگرچہ یہ کتاب ہندی رسم الخط میں تھی پھر بھی احباب کی مدد سے میں نے اُس کے اقتباس رسالہ تسنیم آگرہ میں شایع کرنے شروع کیے۔

اگرچہ اہل وطن نے گرمجوشی کا اظہار نہ کیا لیکن مجھے تو ایک پگ ڈنڈی مل ہی چکی تھی۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ اب کہیں سے کچھ اور تو ملے گا نہیں ”جاسی گرنٹھاولی“ ہی کو شمع راہ بنا کر اسی کا غایر مطالعہ شروع کیا اور پدماوت کے ایک ایسے نسخے کی جستجو میں لگا رہا جو اردو رسم الخط میں ہو

مگر یہ نہ آج ملتا تھا نہ کل — بارے شیخ نعمت اللہ صاحب جاسی کی بدولت میری مراد برآئی۔ پدماوت کا ایک حسب دلخواہ نسخہ ملا اور اُس وقت ملا جب بغیر اس کے کام چل ہی نہ سکتا تھا۔ دو اور کتا ہیں ”آخری کلام“ مصنفہ ملک صاحب اور شاہ سید علی نقی صاحب جاسی کی تصنیف کردہ ایک تاریخ جو خانوادہ پیرزا دگان جاس کے حالات میں ہر انھیں کی کوششوں سے ملیں جن سے ملک صاحب کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں یہی انھیں بلکہ شیخ صاحب نے ملک صاحب کا شجرہ نسب اور ان کے دوستوں کے متعلق بھی کارآمد اطلاعات مہیا فرمائیں۔ اب گویا ہر سکوت ٹوٹی اور مجھے بے مانگے مدد ملنے لگی۔ اکثر حضرات نے اپنے ذخیرہ معلومات سے مجھے کچھ نہ کچھ مرحمت فرمایا وہ بدیرہسی — گو نعمت اللہ صاحب کی امداد کے بعد مجھے کسی صاحب کی معلومات سے کوئی مزید فائدہ نہیں ہوا۔ پھر بھی میں اُن حضرات کا شکر گزار ہوں۔

اسی درمیان میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک صاحب کا نا نہال مانپور (ضلع پرتاب گڑھ اودھ) ہو مگر وہاں تو انھیں کوئی جانتا بھی نہیں — دنیا اپنے نامور فرزندوں کو کس قدر جلد فراموش کر دیتی ہے!!

الہ آباد یونیورسٹی کے ادبی قانونی اور تجارتی شعبہ جات تحقیق کی سال بھر کی کارگزاریاں رسالے کی صورت میں الہ آباد اسٹڈیز (ALLAHABAD STUDIES) کے نام سے شایع ہوتی ہیں اس کی جلد ۶ (حصہ اول) بابت ۱۹۳۲ء میں بھی ایک مضمون انگریزی میں ملک محمد جاسی کے متعلق رائے بہادر لالہ سیتارام صاحب (بی۔ اے) کا (صفحہ ۳۲۳-۳۲۷) میری نگاہ سے گزرا مگر مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس مضمون کا ماخذ وہی

شاہ سید علی نقی کی تاریخ ہو اور کچھ زبانی اخبار — اس مضمون کی نشاہدی جناب چندر بلی صاحب پانڈے ایم اے بنارس ہندو یونیورسٹی نے فرمائی تھی موصوف اُن مسلمان ہندی شعر کے متعلق ایک مقالہ سپرد قلم فرما رہے ہیں جنہوں نے ہندی ادب میں موصوف کا رنگ بھرا ہے مجھے اس سلسلے سے نیاز حاصل ہوا کہ موصوف کو ملک محمد جالنسی کے متعلق لکھنے کے لیے اُن کی ایک کمیاب تصنیف یعنی ”آخری کلام“ کی تلاش تھی اور یہ ان کو میرے پاس سے ملی ۔ اسے پنڈت جی مجھ سے لے گئے اور جالنسی گرتھاوا کی اشاعت حالیہ میں اس کو شامل کر دیا۔

پانڈے جی صحیح معنوں میں طالب علم ہیں اور تحقیق و تدقین کے دلدادہ ادب دوست بھی ہیں اور ادب نواز بھی۔ اُنہوں نے میری بہت عزت افزائی فرمائی اور اپنی اُن تصانیف سے جو اُنہوں نے ملک صاحب کے متعلق کی ہیں مستفید فرمانے کا وعدہ کیا۔ موصوف کے جو مضامین مجھے اب تک ملے اُن میں زیادہ تر پدمات کے رسم الخط اور سال تصنیف کے متعلق بحث کی گئی ہو گو مجھے پنڈت جی کی بعض رایوں سے اختلاف ہو لیکن میں اُن کا ممنون ہوں۔

ان کے علاوہ ”سدھاکر چندریکا“ جو ڈاکٹر گری یرسن اور سدھاکر جی کی دماغ کاوی کا نتیجہ ہو اور جس کا دیباچہ اور ترجمہ انگریزی میں ہو مگر نامکمل اس کو اور نیز ”خزینۃ الاصفیا“ جو ۱۲۸۲ھ کی تصنیف ہو انہیں بھی دیکھا۔ ”خزینۃ الاصفیا“ کے مصنف منشی غلام سرور مرحوم لاہوری ہیں۔ اور کانپور کے مطبع نو کشور میں طبع ہوئی ہو۔ اس کی جلد اول کے صفحہ ۴۳ پر ملک محمد جالنسی کے متعلق کچھ تذکرہ فارسی زبان میں ہو۔

میں نے اپنے ماخذ بیان کر دیے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ باوجود امکانی تلاش کے ملک صاحب کے متعلق کوئی معتبر تاریخی ذریعہ حالات معلوم کرنے کا ہم نہیں پہنچ سکا اور اکثر روایات سینہ بہ سینہ پر قناعت کرنی پڑتی ہو یا پھر ملک صاحب ہی کی کتاب سے استنباط کیا جاسکتا ہے گو یہ دونوں ماخذ ملک صاحب کے متعلق صحیح حالات کے انکشاف کے لیے کافی نہیں لیکن چارہ کار ہی کیا تھا۔ بہ صورت ان ذرائع سے جو نقد معلومات حاصل ہو سکی اور قراین کی کسوٹی پر کھوٹی ثابت نہ ہوئی وہ اس کتاب میں ملے گی۔

ملک صاحب کے رجحان طبع، استعداد، اُن کے تعلقات اور اُن کے دیگر حالات زندگی کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا تھا وہ سب میں نے فراہم کر کے پیش کر دیا۔ بس یہی ہو میری کاوش اور جستجو کا نتیجہ۔

سید کلب مصطفیٰ

۱۔ حالاتِ زندگی

عہد ملک محمد جاسی میں ہندستان کی فضا

محمد قاسم کے سندھ پر حملہ کرنے اور امیر خسرو کے پٹیلی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہونے کی مدت چھ سو سال کے لگ بھگ ہو۔ جہاں دنیا کی تغیر پذیری کا تعلق ہی چھ سو سال کیا صرف چھ سو سال بہت ہوتے ہیں لیکن تمدن اور معاشرت میں انقلاب کے لیے اتنا زمانہ بہت کم سمجھا جاتا ہے خاص کر اس وقت جبکہ تعلقات قائم کرنے میں صرف اجنبیت ہی حائل نہ ہو بلکہ فاتح اور مفتوح کا فرق بھی موجود ہو۔ لیکن ہندستان میں جن تبدیلیوں نے اس قلیل مدت میں رونما ہو کر ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات باہمی کو معاشرت اور تمدن کے اعتبار سے شیر و شکر کا مصداق بنا دیا وہ اس خیال کی تردید کرتی ہیں۔ اب ان خوشگوار تعلقات کی ذمہ دار مسلمانوں کی رواداری ہو یا ہندوؤں کی مہاں نوازی یا یہ دونوں، لیکن واقعہ یہی ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کو آئے ابھی چند روز ہوئے تھے کہ ہندوؤں سے برادرانہ مراسم قائم ہو گئے اور کچھ ذریعے ایسے پیدا ہوئے کہ بالآخر ہندستان اُن کا وطن بن گیا۔ یہ بین الاقوامی تعلقات یہیں تک محدود نہ تھے بلکہ خلفائے عرب کے درباروں میں ہندستان کے علما اور پینڈتوں کی شمع علم اُسی طرح روشن تھی جس طرح مسلمان شاعر اور ادیب سرزمین ہند کو سرچشمہ ہائے علوم سے سیراب کر رہے تھے۔ امیر خسرو نے خالق باری تصنیف کر کے اُن گہرے تعلقات کا ثبوت دیا جو اُس وقت قائم ہو چکے تھے۔ ثبوت ہی نہیں دیا بلکہ ان میں استحکام پیدا کیا حتیٰ کہ زمانہ آگیا کہ عوام "رام اور رجم" کو ایک ماننے

اور خدا خدا کرنے کو رام رام کہنے کا مراد ف جاننے لگے۔ سادھو اور فقیروں کو دونوں مذہب کے لوگ عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سادھو اور فقیروں بھی وہی سمجھے جاتے تھے جو تعصب سے دور یگانگی اور رواداری کے وسیع سمندر کی تھاق تک پہنچے ہوئے تھے۔ بہت دنوں ایک ساتھ رہتے رہتے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ کھلے دل سے زندگی بسر کرنے لگے تھے اور لوگوں کے دلوں اور خیالوں پر افتراق کے بجائے اتحاد کا جذبہ غالب تھا۔ مسلمان ہندوؤں کی رام کہانیاں سنتے تھے اور ہندو مسلمانوں کے ترا نہاتے حمد و نعت۔ نل اور دیشنتی کی پریم کہانی سے مسلمان لطف اندوز ہوتے تھے اور لیلیٰ مجنوں کی داستانِ محبت سن کر ہندو اپنا دل بہلاتے تھے۔ ہندو مہاتما اور مسلمان صوفی ”بھگوت پریم“ اور ”عشقِ حقیقی“ کے سبق دے ہی چکے تھے اب کیا تھا تعلقات قائم ہونے کے بعد ”گیان“ اور ”معرفتِ الہی“ کی منزلیں بھی ساتھ ہی ساتھ طے ہونے لگیں۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کا ہندوؤں کی گھریلو روایات سے دلچسپی لینا اور انھیں تصنیف کا جامہ پہنانا اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ ان کہانیوں کو بیان کر کے مسلمانوں نے جتنا دیا کہ دل کا وجود نہ کسی مذہب سے وابستہ ہو اور نہ جذباتِ محبت ملک و ملت کی قیود میں محدود ہیں یعنی جو باتیں ایک کے رنج و خوشی کا باعث ہیں وہی دوسرے کی، جن تاثرات سے ایک کا دل متاثر ہوتا ہو انھیں سے دوسرے کا بھی غم میں غم ہوتا ہو اور خوشی میں خوشی۔

ترکی، عربی، ہندوئی، بھاشا جینی آہ

چیمہ منہ مارگ پریم کر بکر سراہیں تا ۹

ترجمہ۔ ترکی، عربی، ہندی، بھٹی زبانیں ہیں، ان میں سب اسی زبان کو سراہتے ہیں جس میں محبت کی طرف رہنمائی کی گئی ہو۔

तुकी, अरबो, हिंदुई, भाषा जेती आहि ।

जेहि मँह मारग प्रेम कर, सबै सराहैं ताहि ॥

اشتراک جذبات کا یہ خیال جو عوام کے دلوں میں امیر و خسرو قطبیں میاں اور شاعر جاسی کی بدولت راسخ ہو گیا تھا اُسے سکندر لودی اور علاؤ الدین ایسے بادشاہوں کا تشدد بھی نہ مٹا سکا اور جیسے کاتینسا بنا رہا — ایک طرف تو سکندر لودی متھرا کے مندروں کو گر کر مسجدیں کھڑی کر رہا تھا، کشمیر کے معابد منہدم کر رہا تھا اور ہندوؤں پر طرح طرح کے ظلم توڑ رہا تھا اور دوسری طرف پورب میں شیر شاہ کے والد حسین شاہ کی سرپرستی میں قطبیں ایک ایسی نظم لے کر آئے جس میں مذاہب کے افتراق سے کوسوں دور انسانیت اور محبت کی جھلک آرہی تھی اور جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ

”الناس علیٰ دین ملوکھم“ کا اصول ہرگز اٹل نہیں ہے قطبیں کے

علاوہ دوسرے مسلمانوں نے بھی اس قسم کی پانچ اور ”پریم کہانیاں“ اسی

سے تاریخوں میں ان کا نام حسن ملتا ہے جنہیں سہسرام اور خواص پور جاگیر میں لکھیں۔

۱۵ قطبیں چشتی خاندان کے ایک بزرگ شیخ بُرہان کے شاگرد تھے انھوں نے

”مرگاوتی“ نام کی ایک نظم ۱۱۶۱۰ھ میں لکھی اس میں چند رنگر کے راجہ گن بہت دیو کے

بیٹے (ولی عہد) اور کنچن نگر کے راجہ روپ مرار کی لڑکی مرگاوتی کے محبت کی داستان

لکھی ہے۔

۱۶ ملک محمد جاسی نے اپنے زمانے سے قبل لکھی ہوئی چھ نظموں کا ذکر یوں کیا ہے۔

धिक्रम धँसा प्रेम के बारा ।

सपना वासि कई गयउ पतारा ॥

دکرم دھنسا پریم کے بارا

سپنوت کنھ گیو پتارا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ کیجیے

زمانے کے لگ بھگ لکھ کر بے تعصبی اور رواداری کی تعلیم دی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳

مधु पाछे मुगु घाबति लागी ।

गगनपुरा हुइगा बैरागी ॥

राजकुँवर कंचन पुर गमऊ ।

मिगावती कहँ जोगी भयऊ ॥

साध कुँवर खँडावत जोगू ।

मधु मालति कर कीन्ह बियोगू ॥

प्रेमावति कहँ सुरसरि साधा ।

ऊषा लागि अनिरुध बर बाँधा ॥

مدھو پاچھے مگو دھادت لاگی

گگن پورا ہوئے گا بیراگی

راج کتور کنھن پور گیو

مرگا دتی لنھ جوگی بھیو

سادھ کتور کنڈاوت جوگو

مدھو مالت کر کینھ بیوگو

پریا دت کنھ سر سادھا

اوشا لگ ان رُدھ بر بانڈا

(پدمماوات)

(پردماوت)

”وکرمت“ اور ”اُشانی رُدھ“ کی مشہور کہانیوں کے علاوہ جو اور چار عشق کی

داستانیں ملک محمد جاسی کے پہلے لکھی گئی ہیں اُن میں سے ”مرگاوتی“ اور ”مدھو مالتی“

تول گئی ہیں لیکن ”پریا دت“ اور ”مگدھاوتی“ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ملک محمد نے پدمماوت

انھیں نظموں کے طرز پر لکھی ہو ان کے بعد بھی اس قسم کی نظموں کے لکھنے کا رواج رہا چنانچہ غازی پڑ

کے رہنے والے ایک بزرگ شیخ حسین کے صاحبزادے عثمان ران، نے سنہ ۱۶۷۱ء کے لگ بھگ ”چتراولی“

لکھی جس میں نیپال کے راجا دھرنی دھر کے لڑکے سُحان اور روپ نگر کے راجا پتر سین کی لڑکی

چتراولی کی محبت کا ذکر ہے مثل دوسری نظموں کے زبان اودھی ہے کچھ بھوجپوری کا بھی میل ہے۔

اسی قسم کی ایک دوسری کتاب نور محمد کی ”اندر اوت“ ہے جو سنہ ۱۸۸۶ء بکری میں لکھی گئی تھی۔ اس

سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی تمام پریم کہانیوں کے مصنف مسلمان تھے

جنہوں نے ان کو مشنوی کے طرز پر اور اودھی زبان میں لکھا تھا۔

ملک محمد کا مولد مسکن | انوش قسمتی سے ملک محمد بھی ایسے ہی زمانے میں
جبکہ ہندوؤں اور مسلمان بالکل گھٹلے ملے تھے قصبہ جاس

میں محمد ظہیر الدین بابر شاہ کے عہد میں سن ۹۹۹ھ میں پیدا ہوئے ملک صاحب نے
اپنی پیدائش اور وطن دونوں کا ذکر اپنی ایک تصنیف میں اس طرح فرمایا ہے۔

بھا اوتار مور نو صدی |
بھا اوتار مور نو صدی

(آخری کلام) (آخری کلام)

جاس نگر مور استھانو |

جاس نگر مور استھانو

نगर के नाँव आदि उदयानू ॥

نگر کے ناموں آدمی اُدیانو

(آخری کلام) (آخری کلام)

ملک جی نے اپنے وطن کو ایک دوسرے مقام پر "دھرم استھان" بتایا
ہو جس سے جاس کی طرف سے ملک صاحب کے دل میں حب وطن کا
جذبہ بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہو۔

जयस नगर धर्म असथानू ।

جاس نگر دھرم استھانو

(پدمات) (پدمات)

مندرجہ بالا شعر کا حوالہ دینے کے بعد ملک صاحب کی حب الوطنی کا

اس قصبہ (جاس) کے نامی آدمیوں میں ملک محمد جاسی کا نام آتا ہو جس نے

شیر شاہ کے عہد میں پدمات تصنیف کی، وہ مخدوم اشرف کا چیلہ تھا۔

(ڈسٹرکٹ گزیٹر - جلد ۳۹ - رائے بریلی - صفحہ ۱۸۳)

جاس ملک محمد جاسی کا موطن ہونے کی وجہ سے مشہور ہو۔ یہ سوٹھویں صدی

میں گزرا ہو اس کی ہندی تصنیف پدمات مشہور ہو۔

(امپیریل گزیٹر جلد ۱۳ - اشاعت جدید صفحہ ۹۰۲)

ذکر کر کے خاموش ہو جان اُن کے وطن کی گو نہ حق تلفی ہو اس لیے ضرورت معلوم ہوتی ہو کہ جاس کے اُن حالات پر روشنی ڈالی جائے جن کی بنا پر ملک صاحب نے جاس کو "دھرم استھان" کہا ہو۔

فاتح جاس سید نجم الدین خود ایک ایسے مقدس بزرگ تھے جو اکثر تلواروں کی چھانٹوں میں طاعت حق بجالاتے تھے۔ یہ تلوار کی چھانٹ ہی کہلاتی ہو کہ ایک طرف اجنبی ملک میں گھسان لڑائی ہو رہی ہو اور دوسری طرف لشکر کا سردار مشغول عبادت گزار ہو۔ کم و بیش انھیں خصوصیت کی حامل نسلیں ملک محمد کے زمانے میں بھی موجود تھیں اور یہی وجہ ہو کہ شاعر جاسی نے اپنے وطن جاس کو "دھرم استھان" کہا۔ حقیقت میں وہ عہد پاک تھا بھی ایسا ہی جس کی آغوش میں سید اشرف جہانگیر اور مبارک شاہ بودے ایسے برگزیدگانِ خدا موجود تھے جن کے فیوض باطن سے ملک محمد جاسی کو تصوف اور خدا پرستی میں وہ مراتب حاصل ہو سکے جس کا تصور گویا اُن کے نام کا جزو بن گیا۔

تغییراتِ زمانہ کے کرشمے اربابِ نظر کے لیے محتاجِ بیان نہیں۔ فتح جاس کے بعد آج جاس کی آبادی کو ساڑھے نو سو برس کا زمانہ گزر چکا اور جبکہ ۷

بہر لحظہ بہر ساعت بہر دم دگرگوں میشود احوالِ عالم تو پھر ساڑھے نو سو برس میں تو اتنے لحظے اتنی ساعتیں اور اتنی سائیں شامل ہیں کہ ان کے شمار پر بہترین محاسب بھی قدرت نہیں رکھتا اسی نسبت سے تغیرات بھی بے شمار ہو چکے ہیں اس لیے آج کے جاس پر ملک محمد کے عہد کے جاس کا قیاس کرنا محض بے معنی ہوگا۔

ریلوے اسٹیشن جاس راتے بریلی اور پرتاب گڈھ کے درمیان قصبے کی آبادی سے تقریباً ۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے اسی قصبے کے ایک محلے میں جو کچھانے کے نام سے مشہور ہے۔ ملک محمد کا مکان اب تک موجود ہے جس کی بوسیدگی اور شکستہ حالی زبان حال سے ہندوستانیوں کی غفلت اور بے بسی کا نوحہ پڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کاش شاعر جاسی انگلستان میں ہوتے جہاں شیکسپیر کے مکان کو گویا معبد کا مرتبہ دیا جاتا ہے!!

ملک جی کی پیدائش کے وقت سخت زلزلہ بھی آیا تھا۔ اس کا ذکر

آبوت دھت-چار بیہی ٹانا ।	لے آوت اُدھت چار بدھ ٹھانا
ما بھو کپ جगत अकुलाना ॥	بھابھو کنتپ جگت اکولانا
धरती दीन्ह चक्र बिधि भाई ।	دھرتی دینھ چکر بدھ بھائیں
फिरै अकास रँहट कै नाई ॥	پھری کاس رہٹ کے نائیں
गिरि पहाड़ मोदनि तस हाला ।	گرے پہاڑ مودن تس ہالا
जस चाला चलनी भरि चाला ॥	جس چالا چلنی بھر چالا
मिरित-लोक ज्यों रचा हिंडोला ।	مرت لوک جیون رچا ہنڈولا
सरग पताल पवन खट डोला ॥	سرگ پتال پون کھٹ ڈولا
गिरि पहाड़ परबत हित गगन ।	گر پہاڑ پر بت ہل گئے
सात समुद्र कीच मिल गए ॥	سات سمندر کیچ مل گئے
धरती फाटि, छात भडगनी ।	دھرتی پھاٹ، چھات بھگانی
पुनि भई मया जु सिष्टि दिठानी ॥	پن بھی میا جو شست ڈھانی
जो अस खंभन्ह पाइ कै, सहस जीभ गहिराई	جو اس کھنڈ پائے کے ہس جیہ گہرائیں
सो अस कीन्ह मुहम्मद तोहि अस बपुरे काई	سو اس کینہ محمد تو ہی اس پورے کا ہیں

ملک صاحب موصوف نے خود ہی فرمایا ہے۔

خاندان | شاعر جاسی کے
۱۷ ملک محمد جاسی کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔
شیخ محمد علی ملک

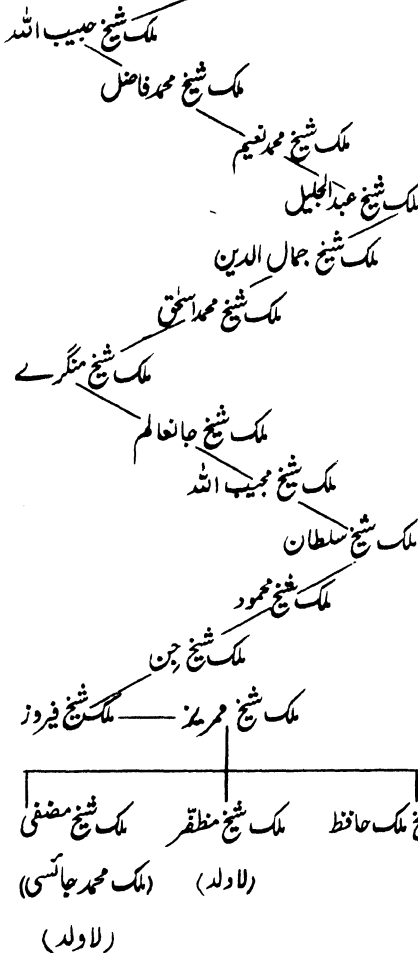
سے تھے جو حسب اور نسب
کے اعتبار سے خاص امتیاز
رکھتے تھے اُن کے والد کا نام
شیخ مہر یز تھا۔ ماں کا نام معلوم
نہیں اتنا معلوم ہے کہ اُن کی
نانہاں مانپور میں تھی اور شیخ
اللہ داد اُن کے نانا تھے۔

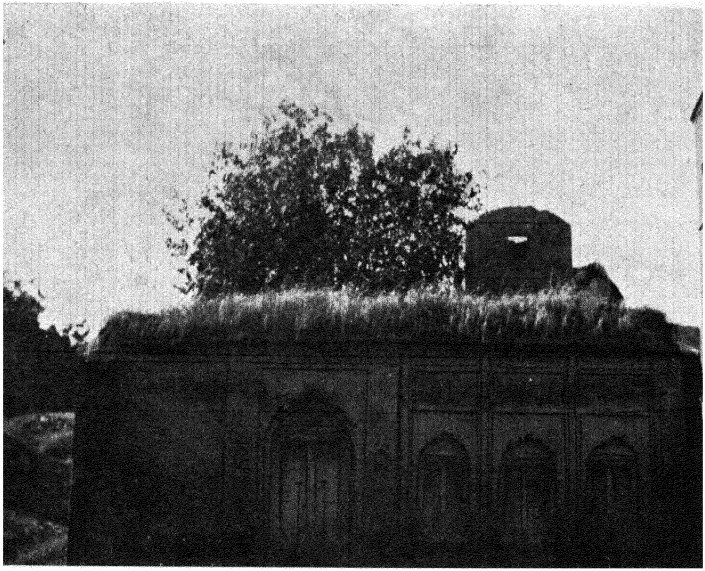
حلیہ | ابھی سات ہی برس
کے تھے کہ شدت کے

ساتھ چیچک نکلی بچنے کی کوئی
امید نہ تھی۔ ماں نے منت
مانی کہ صحت ہونے پر مکن پور
میں مدار شاہ کی زیارت
کروں گی۔ اچھے تو ہو گئے۔

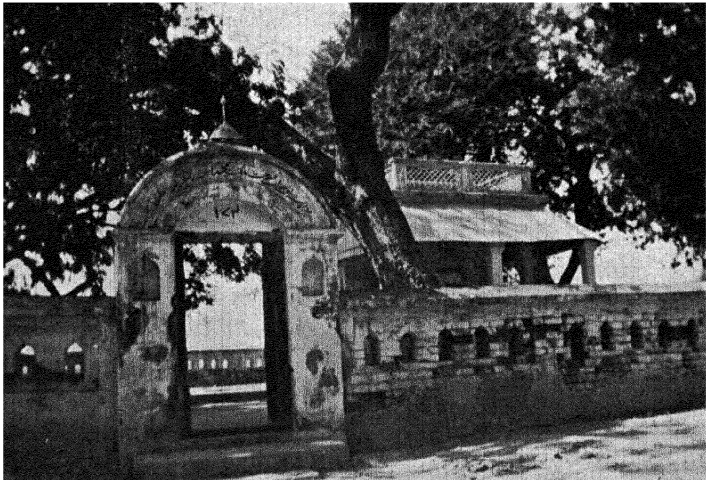
اچھے کیا ہوئے گویا پھر سے
پیدا ہوئے لیکن ایک آنکھ

جاتی رہی اور بہت بد صورت
ہو گئے ان کی بد صورتی کے متعلق ایک قصہ بہت مشہور ہے جس سے اُن کی
۱۷ حاشیہ صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ کیجیے





ملک محمد جایی کا مسکن
واقعہ محلہ کنچانہ، جایی (اودھ)



ملک محمد جایی کا مزار
واقعہ قصہ امیٹھ، ضلع سلطان پور (اودھ)

ماضی جوانی اور سنجیدگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ شیر شاہ کے دربار کا کوئی امیر بہ روايتہا اکبر بادشاہ) جوان کو پہچانتا نہ تھا اُن کے بد صورت چہرے کو دیکھ کر ہنسنا تو اُنھوں نے کمال متانت و سنجیدگی سے پوچھا کہ ”مٹیا ہنسبو کہ کھڑا“ یعنی مٹی کا مضحکہ کرتے ہو کہ کھار کا یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور ان کا نام پوچھ کر معافی مانگی اسی واقعے کو میر حسن دہلوی نے نظم کیا ہے۔

حاشیہ صفحہ ۱۸۷

مدار شاہ کب ہوئے ہیں معلوم نہیں البتہ آئین اکبری میں اُن کے متعلق سب ذیل سطریں پائی جاتی ہیں جن سے اُن کے متعلق کچھ علم حاصل ہو سکتا ہے۔

”لقب او بدیع الدین کہ در ہندی یوم بدو گردد دوا لاپاگی او بگزارد۔ گویند مرید شیخ طیفوری نظامی است۔ ہرگز جامتہ او شوخ گن نہ شدے و با خلق نہ آمیختے۔ بروز دوشنبہ در خلوت آگاہ او کشادہ گشتے و فراواں حاجت خواہ فراہم آمدے آئین چناں بود کہ چون مردم از آمدن باز ماندے۔ داستاں بر سر ایندے در آں میاں جوئندگان را باسخ آمادہ شدے ہر کہ جواب خود شنیدے نیایش کنان بر خواستے و شکر و استاہنا از او برگزارد و سلسلہ مدار یہ را او سر آغاز خوا بگاہ کن پور۔ و ہر سال روز فرو شدن او گرد و ہا گروہ مردم از دور دست بہ آنجا رسد و ہر کیے رنگارنگ علم با خود بردہ نیایش ہا بجا آورد

۱۷ خزنیۃ الاصفیا در سالہ شیخ عبدالقادر جانشی

(نوٹ) خانوادہ جانش مرتبہ شاہ سید علی نقی صاحب میں یہ روایت ایک راجا سے منسوب ہے۔

محققہ میر حسن دہلوی (غیر مطبوعہ) ملا حظہ ہو تعارف۔

۱۸ رموز العارفین

ملک صاحب نے اپنے یک چشم ہونے کا ذکر خود اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ پیدادت میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

اک نین کوئی محمد گئی۔
 اک نین کاہیٰ محمد گئی۔

ترجمہ۔ میں محمد ایک چشم شاعر باکمال ہوں۔

اُسی نظم میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

محمد بائیں دس سبجا اک سرور اک آنکھ

سُھممد باہیٰ دِسا اُجا ॥

اِک سرورن اِک اُراںخ ۱

ترجمہ۔ محمد (ملک محمد) کے بایاں کان اور بائیں آنکھ نہ تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چپک میں اُن کی بائیں آنکھ جاتی رہی تھی اور بائیں کان سے بہرے ہو گئے تھے۔ ملک لولے لنگڑے اور کوزہ پشت بھی تھے۔ بہر حال ماں کے لیے اُن کا جی بچنا ہی بہت نعمت تھی مگر افسوس کہ منت اُتارنے سے پہلے ہی ماں کا انتقال ہو گیا۔

باپ پہلے ہی وفات پا چکے تھے یتیم اور بے والی وارث ہو کر سادھوؤں فقیروں کے ساتھ رہنے لگے۔ انھیں لوگوں کی صحبت کا اثر ہوا کہ یہ بھی بڑے درویشوں میں سمجھے جانے لگے اور دراصل تھے بھی ایسے ہی۔

خطاب | ملک ایک عربی لفظ ہے جو اپنے مترادف شاہ کی طرح عموماً بادشاہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حکومت مصر میں یہ

خطاب تھا وزیر اعظم اور سپہ سالار کا۔ خلجی بادشاہوں کے زمانے میں اس لفظ سے نوابوں کو مخاطب کرتے تھے جب علاؤ الدین نے اپنے چچا کو قتل کرنے کے لیے بہت سے تلکوں کو مقرر کیا تو یہ لفظ بہت اہم ہو گیا۔

تاریخ فیروز شاہی میں تحریر ہو کہ "ملک بارہ سواروں کے افسر کو ہتے ہیں۔ ایک جگہ نظر سے گزرا ہو کہ "ملک اُس سردار کو کہتے ہیں جس کے اس دس ہزار سوار ہوں اور ولایت یعنی ایران میں ملک زمیندار کو کہتے ہیں۔ تعجب کی بات ہو کہ گونڈہ اور فیض آباد کے ضلعوں کے اہمیر بھی لی نام سے مشہور ہیں۔

بہر حال لفظ ملک کے جو معنی بھی لیے جائیں خود شاعر جانشی کے شاغل اور رجحان طبیعت کے اعتبار سے ان کے نام کے ساتھ اس لفظ شامل ہونا کسی قدر تعجب خیز ضرور معلوم ہوتا ہو لیکن حیرت انگیز لوگوں ہو سکتی ہو جو شاعر جانشی کے خاندانی وقار اور وجاہت سے نا آشنا باور نہ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہو کہ شاعر جانشی کے بزرگ عرصے سے کے خطاب سے سرفراز چلے آتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ اُن کے

لے "و بعضے نوشتہ کہ ملک بفتح بیسم و کسر لام بزمانہ قدیم امیر ایمری گفتند" (غیاث اللغات مطبوعہ مطبع نول کشور ۱۸۶۷ء)

۱۷ بھو چور اور غازی پور کے راجا جگت دیو (۱۵۲۴-۱۵۳۳ء) (جو شیر شاہ کے دوست تھے اور کبسر کی اُس لڑائی میں موجود تھے جس میں شیر شاہ نے ہمایوں شکست دی تھی) کے یہاں گندھورائے نام ایک مشہور گویا تھا جس سے ملک محمد بہت انس تھا اُنھوں نے گندھورائے کو دعا دی تھی کہ تمہارے خاندان میں ہمیشگی ہمیشہ رہے گا بشرطیکہ ہماری محبت کی یادگار کے طور پر تم اپنے خاندان کے ناموں کے ساتھ لفظ "ملک" لگا دو۔ تب سے گندھورائے کے خاندان کے لوگ (جواب تک بیا ضلع کے رائے پڑا اور ہلدی کے علاقوں میں رہتے ہیں) ملک کہلاتے ہیں اور مشہور گویے ہیں۔

جد اعلیٰ شیخ محمد علی نے جب غازی ابوالقاسم کے ساتھ ہندستان میں قدم رکھا تو اس وقت بھی وہ ملک کہلاتے تھے اور یہ خطاب اب تک اُن کے خاندان میں نسلاً بعد نسل برابر چلا آ رہا ہو۔

لقب | ملک صاحب کا لقب محقق ہندی ہے اور اُن کو شیخ شہید بھی کہتے ہیں۔

ذریعہ معاش | شاعر جاسی کا ذریعہ معاش زراعت تھا۔ چند سگیے آبائی زمین تھی۔ جوت بوکر بسر اوقات کرتے تھے۔

اولاد | یہ تو سب جانتے ہیں کہ ملک صاحب دنیا سے لا ولدا لٹھے اور یہ بھی اکثر حضرات کو معلوم ہے کہ اُن کے سات بیٹے تھے اُن ساتوں کے انتقال کے متعلق مختلف روایتیں ہیں لیکن اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سب بہ یک وقت ضایع ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ملک صاحب کو اس کا جو صدمہ بھی ہوا ہو وہ کم ہے لیکن اس سانحے کی جو وجہ اہل عقیدت بتاتے ہیں اس کو اگر صحیح مان لیا جائے تو ملک صاحب کا صدمہ اور بھی عظیم ٹھہرتا ہے۔

روایت ہے کہ ان کے پیر سید شاہ مبارک بودے حکیموں کی تجویز سے پوستے کا پانی استعمال فرماتے تھے کہ بھوک کم لگے اور نیند کم آئے۔ ملک صاحب نے بوجہ اُس شوخی اور ظرافت کے جو فطرت نے اُنہیں عطا فرمائی تھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔ نظم میں جس کا نام ”پوستی نامہ“ رکھا اور اس میں چند شعر پوستے کی مذمت میں بھی شامل کر دیے جو اُن کے پیر کو پسند نہ آئے اور انھوں نے غصے میں فرمایا کہ ”دُرِ نپوتے“ کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ تیرا

۱۔ ماخوذ از خزینۃ الاصفیاء جلد اول صفحہ ۴۷۳ (مصنفہ منشی غلام سرور صاحب)

پیر پستی ہو۔“ مبارک شاہ کو یہ کہے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ خبر آئی کہ اُن کے ساتوں لڑکے جو ایک جگہ کھانا کھا رہے تھے چھت کے نیچے دب کر مر گئے۔

شاہ صاحب کو افسوس ہوا اور انھوں نے دعا کے طور پر پیشینگوئی کی کہ سات لڑکوں کے عوض تمھاری چودہ تصانیف قیامت تک بطور یادگار باقی رہیں گی۔ یہ سن کر ملک صاحب کو فی الجملہ تسکین ہو گئی۔

اجاب | پداوت کے شروع میں ملک صاحب نے اپنے چار دوستوں کے نام لکھے ہیں — ۱۔ یوسف ملک۔ ۲۔ سالار خادم۔ ۳۔ سلوئے میاں۔ ۴۔ بڑے شیخ — اور ان کے اوصاف بھی بیان کیے، میں۔ یوسف ملک کو عالم کامل، صاحب فیض اور رازدار سخن بتایا ہو۔ سالار خادم کو صاحب فراست، شمشیر زن اور بہادر کہا ہو۔ میاں سلوئے کی تعریف شیر دل اور شجاع کہہ کر کی ہو۔ اور شیخ بڑے کو ستودہ صفت اور کامل فقیر قرار دیا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ سبھوں کو درویش بھی ظاہر کیا ہو۔

۱۔ کچھ لوگ اس واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ شاہ صاحب نے یہ سن کر ملک صاحب سے دریافت کیا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ تمھارے لڑکے زندہ ہو جائیں یا تمھارا نام تمھاری تصنیف کی بدولت قیامت تک زندہ رہے۔ ملک صاحب نے فرمایا سب کچھ خدا کے اختیار میں ہو لیکن آپ یہی دعا فرمائیے کہ فرزندوں سے نہ سہی کتابوں ہی کے ذریعے سے نام باقی رہے۔

۲۔ حاشیہ صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجیے

- ۱۔ ملک یوسف { عہد ملک محمد جاسی میں ان ناموں کے شرف کا ذکر
۲۔ سالار خادم { جاس کے شجروں اور وہاں کے پڑانے کا غذات
۳۔ شیخ بڑے { میں پایا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ ان لوگوں کے

حاشیہ صفحہ ۲۳

احباب کے متعلق ملک صاحب نے پداوت میں حسب ذیل چوپائی لکھی ہے۔
ترجمہ { محمد شاعر نے چار دوست پاتے جنہوں | چار میت کب محمد پائے
نے دوستی کو انتہا تک پہنچا دیا۔ | جو مقامی سر پہنچائے

چار میت کب محمد پائے

چوہر میت کب محمد پائے

ترجمہ { یوسف ملک جو عالم کامل اور صاحب فیض | یوسف ملک پڑت ہو گیا نی
ہیں اولاً راز دل انہوں نے جانا۔ | پہلے بھید بات دے جانی

یوسف ملک پندیت بہت جانی

پہلے بھید بات دے جانی

ترجمہ { پھر سالار خادم نے جو صاحب فراست | پونہ سالار خادم مت ماہاں
ہیں اور جن کا ہاتھ شمشیر زنی اور سخاوت میں بلند | کھانڈے دان اُبھو نت باہاں
رہتا ہے۔

پونہ سالار خادم مت ماہاں

کھانڈے دان اُبھو نت ماہاں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ کیجیے

متعلق اور کوئی معلومات بہم نہیں پہنچ سکی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴

ترجمہ { تیسرے میاں سلو نے شیر کی طرح شجاع اور | میاں سلو نے سنگھ بریارو
شمشیر زن ہیں۔ | بیرکھیت رن کھڑگ جو جھارو

میاں سلتونے سیخ بری یار ۱۔

بریر سلت رن سڈگ جومارو ॥

ترجمہ { شیخ بڑے۔ بڑے کامل اور ستودہ صفات ہیں | شیخ بڑے بڑے سدھ بکھانا
کالموں نے ان کی بزرگی تسلیم کی ہے۔ | کیے آدیں سدھ بڑ جانا

اسکھ بڈے بڈ سیدھ بکھانا ۱۔ | کپہ آدیس سیدھ بکھانا ॥

ترجمہ { ان چاروں کو اطراف عالم کے علم حاصل ہے اور | چارو پتر و ساگن پڑھے
آپس میں بڑی محبت سے رہتے ہیں۔ | اوسنچوگ گوسائیں گڑھے

چاریت چتور دسا گون پدے ۱۔

آو سنجوگ گوساڈ گدھے ॥

ترجمہ { جو درخت صندل کے پاس ہوتا ہے اس میں چندن | برکش ہوئے جو چندن باسا
کی سی خوشبو پیدا ہوتی ہے خواہ وہ بید ہی کا پیر کیوں نہ ہو۔ | چندن ہوئے بید ہی باسا

بیریکھ ہوڈ جوی چندن پاسا ۱۔

چندن ہوڈ بیدھی تہی باسا ॥

ترجمہ { محمد چارو دوست مل کے جب ایک دل | محمد چارو میت مل بھٹے جو ایکے چت
ہو گئے اور اس عالم میں نباہ ہو گیا تو پھر آخرت | ایہہ جگ ساتے جو نبھا اڈہ جگ بکھرن کت
میں کیسے جدا ہوں گے۔

محمد محمد چارو میت مل بھٹے جو ایکے چت ۱۔

پہی جگ ساتے جو نبھا اڈہ جگ بکھرن کت ॥

۴۔ میاں سلونے۔ شاہ مبارک بودے کے خلیفہ اور ملک محمد جاسی کے پیر بھائی تھے۔ سلسلہ نسب حضرت ایوب انصاری تک پہنچتا ہو۔ بڑے عالی منش، شجاع، بلند ہمت اور ریاضت پسند تھے ان کا مزار قصبہ جاس میں دکن کی جانب محلہ شیخانہ میں واقع ہو اور ان کا اکھاڑہ پیرانی کا بجی ہوس کے قریب متصل بازار غفور گنج تھا۔ تارک الدنیا اور لا ولد تھے۔

شجرہ نسب میاں سلونے

۱۷

خواجہ ابوالشمس انصاری شیخ الاسلام

وفات ۸۱۷ھ

ابراہیم — ثابت شاہ — منظور شاہ — خواجہ ثابت علی
(جد اعلیٰ انصار باقی جاس)
آبک شاہ — ابوالعاض — محمود شاہ دلی شیراز — شیخ عبدالصمد
(مرید حضرت سلطان سید اشرف جہانگیر سمنانی)

شیخ محمد — شیخ احمد — شیخ محمد جلال — شیخ عبدالقادر
شیخ شرف الدین — جلال الدین بہاؤ الدین شیخ بدے — شیخ حسین — شیخ محمود
شیخ بن خروار — شیخ سلونے

یہ دونوں نام اور جگہ بھی ملتے ہیں مثلاً شیخ بڑھا کا ذکر تو اس دستاویز میں بھی ہو جو شیخ اشرف (نعت اللہ) نے ۸۲۷ھ میں تحریر کی ہو اور جس میں اپنا سلسلہ نسب یوں درج کیا ہو

شیخ بڑھا — فیض اللہ — نعمت اشرف — برکت اللہ — مبارک اللہ
مکن ہو ملک صاحب وائے شیخ بڑھے یہی شیخ بڑھا ہوں۔ میاں سلونے سید نجم الدین فاتح جاس کی نسل میں بھی ایک بزرگ کا نام ہو۔

پُرانے کاغذات میں سے ایک کاغذ پر شیخ سلونہ کے دستخط حسب ذیل عبارت کے ساتھ ہیں ”سلونہ بر خوردار انصاری گواہ شد بخطہ“ ایک دوسری دستاویز پر ”سلونہ بر خوردار گواہ شد“ لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ دونوں دستاویز شاہ محمد اشرف اشرافی جاسی کے یہاں موجود ہیں۔ اول الذکر کی تاریخ تحریر ۹۔ ربیع الثانی ۱۰۲۹ھ اور دوسرے کی تاریخ تحریر ۱۲۔ ربیع الثانی ۱۰۲۹ھ ہے۔

مذہب اتنا کہنے کے بعد کہ ملک صاحب ایک فقیر نش اور صوفی صفت بزرگ تھے اور انھوں نے اسلام کی گود میں پرورش پائی۔ اُن کے اعتقادات اور مذہب کے متعلق کچھ اور کہنا ضروری نہیں پھر بھی اُن کی تصانیف کے سمجھنے کے لیے بہتر ہو کہ اُن کے معتقدات کی بعض ضروری تفصیلات پر عبور ہو اس لیے کہ اس کا اثر ان کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ ملک محمد جاسی صرف اس وجہ سے مسلمان نہیں تھے کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے اور آخر وقت تک اسی مذہب پر قائم رہے۔ بلکہ وہ مذہب اسلام کے تمام اصول و فروع کا دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ہاں مسلک تصوف کی طرف بھی رجحان تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ خدا تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ نہیں ہے۔ اکھراڈ میں ایک جگہ اس کے متعلق خود فرماتے ہیں۔

بدھنا کے مارگ ہیں تیتے
سرگ نکھت تن روداں جیتے

बिधना के मारग हैं तेते ।

सरग नखत तन रोवा जेतें ॥

ترجمہ { خدا تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں جتنے آسمان پر تارے یا

بدن پر روتیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام کو راہ مستقیم سمجھتے تھے جس کا انھوں نے اکھراڈ میں ایک مقام پر اظہار بھی کیا ہے۔

تھ منہ پنہتہ کہوں بھل گائی جیہ دونوں جگ چھاج بڑھائی
سو بڑ پنہتہ محمد کیرا ہر نزل کیلا س بسا

तिन्ह मंह पंथ कहौ भल गाई ।

जेहि दोनो जग छाज बढ़ाई ॥

सो बड़ पंथ मुहम्मद केरा ।

है निरमल कैलास बसेरा ॥

ترجمہ { ان میں کاسب سے بھلا راستہ بتاتا ہوں جس سے دونوں جہان میں عزت افزائی ہوتی ہے وہ راستہ محمد کا ہے جو بہشت کا ٹھکانا ہے۔

اسلام کی صداقت کے متعلق اکھراڈ میں ایک جگہ اور فرمایا ہے۔

ساخنی راہ شریعت، جہ بسواس نہ ہوتے

پانور رکھ تیتھ سیر طھی نبھم پہنچے سوئے

ترجمہ { شریعت (اسلام) کا راستہ سچا ہے جس کو یقین نہ ہو وہ اس راہ میں قدم رکھ کر دیکھے کہ وہ منزل مقصود تک کس طرح بے کھٹکے پہنچتا ہے۔

ملک صاحب کے عہد میں مذہبیت جاس میں غالب تھی اور تصوف بھی اپنے انتہائے کمال کو پہنچا تھا گو یا ملک صاحب نے آنکھ کھولی ارادت اور عقیدہ تمندی کے آغوش میں پروان چڑھے تصوف کے سائے میں اور جان دی دونوں کے متحدہ آستانے پر — یہی وجہ ہے کہ

مذہب اور تصوف دونوں کی جھلک ملک صاحب کی تصانیف میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔

اعتقادات مذہبی | پدمات اور لکھنؤ ڈوٹ دونوں میں مذہبی اعتقادات کا ذکر ملتا ہے اور آخری کلام کی تو بنیاد ہی اعتقاد پر ہے۔

۱۔ روز حساب مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال نامے پیش ہوں گے جو میزانِ عدل میں تولے جائیں گے اور بارگاہِ عدل میں انسان کے تمام اعضا گواہ کی حیثیت سے اعمال کی تصدیق کریں گے جن کی بد اعمالیوں کا پلہ بھاری ہوگا وہ دوزخ میں داخل کیے جائیں گے باقی جنت کی سیر کریں گے۔ اس اعتقاد کا ذکر پدمات میں اس طرح موجود ہے۔

گن او گن بدھنا پوچھ ہو بہہ لیکھ او جوکھ
دی بن اب آگے ہو کرب جگت کر موکھ
ہاتھ پاؤ سروں اور آنکھی
اوسب اہاں بھریں مل ساکھی

ترجمہ { اچھائی اور بُرائی خدا پوچھے گا۔ حساب کتاب ہوگا۔ جنہوں نے دنیا میں اچھا کام کیا ہوگا وہ انکسار کے ساتھ آئیں گے اور انہیں بہشت

गुन औगुन बिधिनापुछबहोइहि लखऔजो ख
वैबिनउब आगेहो, करब जगत कर मोख ॥

हाथ, पांख, सरन औ आखी ।

ए सब उहां भरहि मिलि साखी ॥

ملے گی وہاں ہاتھ پاؤں، کان اور آنکھیں سب مل کر گواہی دیں گے۔

۲۔ صراط۔ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ جنت کی راہ میں ایک نہایت دشوار گزار مرحلہ ہے۔ نیک بندے اس پر سے گزر جاتے ہیں اور بدکار قاصر رہتے ہیں اس پُل کا ذکر پداوت میں تو بغیر نام کے اور اکھراوٹ میں نام کے ساتھ ہوا ہے۔

پداوت۔ کھاڑے چاہیں مین بہتائی بار چاہہ تا کر پترائی
ترجمہ { کسی کے واسطے تیز دھار والی تلوار بن جاتا ہے اور کچھ کے لیے پُل۔

खाइ चाहि पैनि बहुतार्ई ।

बार चाहि ताकर पतरार्ई ॥

(पदमावत)

اکھراوٹ۔ ناسک پُل صراط تہ چلا
تہہ کر بھنواہیں ہیں دوئی پلا
ترجمہ { ناسک گویا (پُل) صراط کا راستہ چلا گیا ہے۔

नासिक पुलसरात पथ चला ।

तेहि कर भौहैं हैं दुई पला ॥

(अखरावठ)

۳۔ ایک اور اعتقاد۔ قرآن میں آدم کے جنت سے نکالے جانے کا سبب حکم خدا کی خلاف ورزی ظاہر کیا گیا ہے اور اسی سلسلے میں شیطان کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ پداوت میں بھی پدمنی کی رخصتی کے وقت اس کی سہیلیوں کی زبانی اس خیال کو یوں ظاہر کیا

آد انت جو پتا ہمارا او ہو نہ یہ دن سہے بچارا
چھوہ نہ کینہہ نچھو ہی او ہو کا ہم دوش لاگ اس گوہر

مادی اُنت جو پتا ہمارا । آوہ نہ یہ دن ہیہہ بیچارا ॥

آوہ نہ کینہہ نچھو ہی او ہو ۔ کاہم دوش لاگ اس گوہر ॥

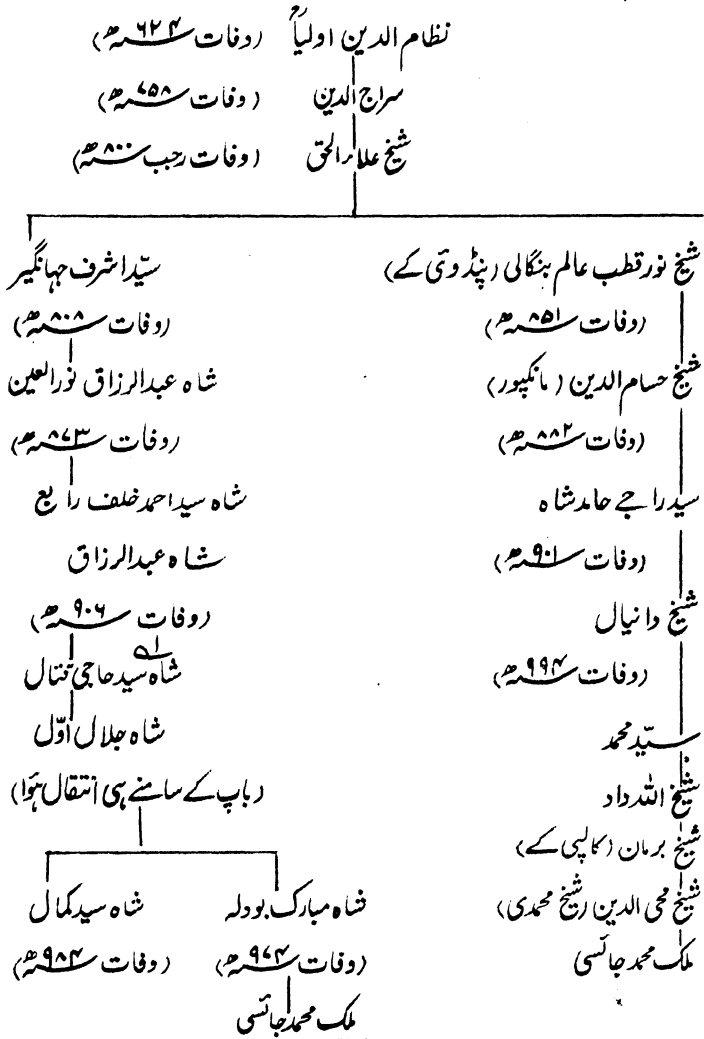
ترجمہ { ہمارا جو اولین باپ ہر اس نے بھی اس دن کی فکر نہ کی تھی اور یہ خیال نہ کیا ہو گا کہ ایک دانہ گندم سے ہم پر یہ الزام آجائے گا۔ اپنے مذہب کے اس قد پابند ہونے کے بعد بھی ملک محمد تعصب نہ تھے یہی نہیں بلکہ تعصب سے انھیں نفرت سی تھی چنانچہ ایک روز جب میٹھی کا راجا عبادت میں مشغول تھا تو ان کو اس وجہ سے محل تک جانے کی اجازت نہیں ملی کہ یہ مسلمان تھے اس سے ان کو بہت رنج ہوا اور خشمگیں واپس آئے جب راجا کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ نادم ہوا کہ ایسے صلح کل مذہب رکھنے والے کو میری عبادت گاہ میں آنے سے کیوں روکا گیا۔ واقعی اُن کا مسلک محبت تھا اور بس۔ شاعر جاسی کی بے تعصبی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے راجپوتوں کی بہادری کو کیسا کیسا سراہا اور اس کو اپنی ایک غیر فانی نظم کا موضوع قرار دیا۔ وہ ہر مذہب کے بزرگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رواداری اُن کا مذہب تھا اور اُنس اُن کا شعار۔

پداوت اور اکھراوٹ دونوں میں
ملک صاحب نے اپنے مُرشد کے

ارادت یا شرف بیعت

سلسلہ بیعت کا ذکر بہت شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔ اپنے آخری کلام میں بھی شاعر جاسی نے اپنی ارادت اور عقیدت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان تذکروں

سے حسب ذیل سلسلہ بیعت مستنبط ہوتا ہے۔ جو شاہ نظام الدین اولیاء
تک پہنچتا ہے۔



سلسلہ ان بزرگ نے شاہ مبارک بودے اور شاہ کمال دونوں کو تعلیم دی۔

اگرچہ اس سلسلے سے ملک محمد جاسی کا بہ یک وقت محی الدین اور شاہ مبارک بودلہ دونوں کی بیعت میں ہونا ظاہر ہوتا ہو لیکن ملک صاحب کے اندازِ تحاطب اور ترتیبِ بیان میں جو فرق نمایاں ہو اس سے اور نیز دیگر قرابن سے یقینی طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہو کہ ملک صاحب کو اولاً شاہ مبارک بودلے سے ارادت تھی اور ان کا شمار شاہ صاحب کے خلفائے میں تھا۔

ملک صاحب کا ایک ابتدائی تصنیف ”آخری کلام“ میں اپنی ارادت کا ذکر فرماتے ہوئے سید اشرف جہانگیر کو ”پیر پیارا“ اور ”مانک اُجیارا“ (آبدار ہیرا) کہنا اور اس سلسلے میں محی الدین کا قطعاً ذکر نہ کرنا بھی اس بات کا بین ثبوت ہو کہ ملک صاحب کا سلسلہ ارادت ابتداءً سید اشرف جہانگیر کے گھرانے سے تھا بعد میں محی الدین سے بھی شرفِ بیعت حاصل ہوا جیسا کہ بعد کی دو تصنیفات یعنی پدماوت اور اکھراٹ میں سلسلہ ارادت ان کے نام کے ساتھ ”گرو“ اور ”کھبوک“ کے اضافے سے ظاہر ہو۔

۱۔ خلیفہ دوم از مریدان حضرت سید مبارک بودلہ مستغرق بحرِ عشق حضرت احد جلّ جلالہٗ دو اوقف اسرار شریعت جناب احمد صلی اللہ علیہ وسلم جناب ملک محمد جاسی ہستند کہ حضرت ایشاں از وقف اسلاف خود ارادت و عقیدت بایں دو دماں علیہ اشرفیہ و خاندان سید احمدیہ داشتند۔

(رسالہ عبدالقادر جاسی)

۲۔ ”تن گھر ہوں مرید ہو پیرو“ (آخری کلام)

۳۔ ”مانک اک پا یوں اُجیارا“ سید اشرف پیر پیارا

(آخری کلام)

سید اشرف جہانگیر اور اُن کے گھرانے کے ساتھ جس خلوص اور عقیدت مندی کا اظہار ملک محمد جاسی نے فرمایا ہے اور جن الفاظ میں خاندان اشرفی کے چشم و چراغ شاہ مبارک بودے کو سراہا ہے۔ وہ جاس کے اس مقتدر خاندان کے عظمت اور مرتبت کے آئینہ دار ہیں۔

شاہ مبارک بودے | آپ اپنے والد ماجد شاہ جلال اول سے ارادت رکھتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے۔ خاندان اشرفی کی خصوصیات کی بنا پر افراد خاندان کو جو شہرت اور مقبولیت اپنے اپنے عہد میں حاصل ہوئی وہ تنہا شاہ مبارک بودے کی شہرت کی ضامن تھی اس پر خود شاہ صاحب کی غیر معمولی قابلیت اُن کا زہد و ورع اور اُن کے جد امجد حاجی شاقال کی تعلیم و تربیت نے جو اضافہ کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا اہل نظر کے واسطے دشوار نہیں — ریاضت اور نفس کی پاکیزگی نے تصوف کے جن بلند مراتب پر پہنچا دیا تھا اس نے عزت اور اعتبار میں ایسا اضافہ کیا کہ خاندان اشرفی کا کوئی فرزند قبولیت عام میں ان تک نہیں پہنچتا۔ دینی و جاہت کے ساتھ ساتھ دنیوی اقتدار بھی کم نہ تھا۔ ایسے ذی مرتبت بزرگ اور دین و دنیا کے ایسے بلند دماغ اور باوقار مالک کے سامنے ظاہر ہو کہ کسی کیسی ہستیوں نے جبہ سائی نہ کی ہوگی — خلفا کے زمرے میں حضرت نظام الدین بندگی میاں۔ حضرت ملک محمد جاسی اور میاں سلونے ایسے درویش اور کالے پہاڑ جیسی ہستی شامل تھے۔ شاہ صاحب کی تعلیم نے نہ معلوم ایسے اور کتنے درویشوں کو تصوف کی ایسی بلندیوں پر پہنچا دیا کہ آج صدیوں

۱۵ "وے مخدوم جگت کے ہوں ان کے گھر باند" (پداوت)

بعد بھی ایک عالم اُن سے فیوض روحانی حاصل کرتا ہی اور اُن کی آرام گاہیں مرجع خاص و عام بنی ہوئی ہیں۔

درس گاہ تصوف | تاریخی اور مذہبی اعتبار سے ایک عمارت جاس میں خاص اہمیت رکھتی ہی جو درگاہ مخدوم صاحب کے

نام سے مشہور ہی اور بہت سی روایات کی حامل بتائی جاتی ہی یہ سید اشرف چہانگیر کی درگاہ ہی جو سید صاحب موصوف کے چلہ کشی کی یادگار ہی اس کا تذکرہ نہ صرف اس لیے کیا گیا کہ مرجع خلائق اور اہل تصوف کے لیے گنجینہ اسرار ہی بلکہ اس لیے بھی کہ یہی وہ مقام ہی جہاں ملک صاحب کو تصوف کے درس دیے گئے اور جہاں سے اجازت تبلیغ اُن کو عطا ہوئی۔

اجازت تصوف | تصوف کی طرف ملک صاحب کو فطرۃً رجحان تھا اور ریاضت و عبادت کے دلدادہ تھے لیکن ناقص الاعضا

ہونے کی وجہ سے تحصیل علم باطن کا حق نہ کر سکنے کے سبب مایوس ہو گئے تھے ایک مرتبہ سید مبارک بودے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے ذوق و مجبوری کا ذکر کیا ان کے مرشد نے کہا کچھ مضائقہ نہیں۔ غرض مشغول ریاضت ہوئے اور شاہ صاحب نے حکم دیا کہ بغیر مہمان کے کھانا نہ کھانا ملک صاحب نے ایسا ہی کرنا شروع کیا۔ حسن اتفاق سے ایک روز بہت تلاش و جستجو کے بعد ایک جذامی لکڑہارا ملا۔ ملک صاحب نے اسی کو دعوت طعام دے دی اور اسے اپنے قیام گاہ پر لائے جب وہ آیا تو ایک ہی فیرنی کے پیالے میں اپنے ساتھ کھانے کو کہا اس نے بہت کچھ عذر کیا اپنی حالت دکھائی مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور بصد اصرار اس کو اپنے ہی پیالے میں شرکت پر راضی کیا کچی ہوئی فیرنی کو جو آتار مرض کی سرایت سے بد رنگ ہو چکی

تھی آنکھ بند کر کے پنی گئے جب آنکھ کھولی تو اس جذامی کو غایب پایا اور اپنے کو کشادہ دل - گویا اس واقعے نے ان کی دنیا بدل دی یہاں تک کہ ان کے پیر نے انھیں خلیفہ بنا کر امیٹی بھیجا۔

امیٹی کو روانگی | ملک صاحب کے امیٹی جانے کا واقعہ اہم ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا دلچسپ بھی ہے ایک روز حضرت

بندگی نظام الدین اور حضرت ملک محمد جاسی نے صلاح کی کہ آخر یہ درس و تعلیم کب تک جاری رہے گی کبھی اجارہ تصوف بھی نصیب ہوگا۔ آقہ پیر مرشد سے عرض کریں کہ ہم کو کوئی ولایت سپرد ہو کہ ہم بھی تصوف کی تبلیغ کریں اور خلق خدا کو فائدہ پہنچائیں۔ حضرت مبارک نے کچھ غور و فکر کے بعد کہا کہ تم دونوں امیٹی ہیں جا کر وعظ و پند کا سلسلہ چھیڑو؛ ان دونوں کو فکر لاحق ہوتی کہ بھلا دو پیر ایک مقام پر کیسے رہیں گے۔ دو تلواریں ایک نیام میں کیسے سمائیں گی لیکن یہ حضرت پیر مرشد کے ادب کے لحاظ سے عذر نامناسب خیال کر کے خاموش رہے۔ آخر ملک صاحب کے دل میں یہ بات آئی کہ درگاہ مبارک شاہی میں دو دروازے ہیں ایک مشرق میں ایک مغرب میں یہ خیال آتے ہی ملک صاحب نے بندگی میاں سے کہا کہ بھائی مغرب کے دروازے سے تم جاؤ اور مشرق والے سے میں جاتا ہوں بندگی میاں لکھنؤ والی امیٹی پہنچے رجو اب بندگی میاں کی امیٹی کے نام سے مشہور ہو) اور ملک صاحب گڈھ امیٹی میں وارد ہوئے اور وہیں کوٹ سے کچھ دور منگرا کے جنگل میں قیام کیا۔

شاعر جاسی کے امیٹی جانے کے متعلق ایک اور روایت بھی مشہور ہے یعنی جب رفتہ رفتہ شاعر جاسی کی شہرت حدود درگاہ سے نکل کر دور دور

پھیلنے لگی تو ان کو پہنچا ہوا فقیر سمجھ کر بہت سے لوگ ان کے مرید ہو گئے اور ان کے اشعار بازاروں اور راہوں میں پڑھے جانے لگے۔ ایک فقیر ان کے بارہ ماہ سے کو امیٹی میں گکا کر بھیک مانگا کرتا تھا ایک دن امیٹی کے راجا رام سنگھ نے اس بارہ ماہ سے خاص کر اس دوپے کو

کنول جو بگسا مانسر بن جل گیو سکھائے

سو کھ بیل پن پلہے جو پوہ سینچے آئے

ترجمہ { کنول مانسر میں بغیر پانی کے سوکھ گیا۔ سوکھ جانے پر بھی شکفتہ ہو جائے گا اگر محبوب اس کو سینچے۔

سن کر پوچھا ”شاہ جی یہ کس کا دوہا ہے؟“

جواب میں اس فقیر سے ملک محمد کا نام سن کر راجا نے اُن کو بڑی عزت سے اپنے یہاں بلایا تب سے یہ امیٹی میں رہنے لگے اور پدمات دہی ختم کی۔ کہتے ہیں کہ راجا کے کوئی اولاد نہ تھی جب ان کی دعا کی برکت سے راجا کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو اُن کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

علمی استعداد | پدمات میں رمل، جغرافیہ، تاریخ اور ہندوؤں کی معاشرت و رسوم کے متعلق ذکر آیا ہے۔ فارسی،

سنسکرت، قرآن اور وید سے بھی بعض بعض مقامات پر واقفیت ظاہر ہوتی ہے لیکن محض اس قسم کے الفاظ کے متن میں آنے سے یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ ان تمام علوم پر کما حقہ حاوی تھے سولھویں صدی

کंबल जो विगसा मानसर बिनु जलगायउ मुत्ताए ।

सूखि बेलि पुनि मल्लुहै, जो पिउ सींचै आर ॥

(पदमावत)

کے لکھے پڑھے مسلمان ہو کر ملک محمد جاسی کا فارسی اور قرآن سے واقف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور آخر دم تک اسی مذہب کے پابند رہے یہی وجہ ہو کہ ملک صاحب نے اپنی تصانیف میں کہیں فارسی فقرات، شعروں اور ضرب الامثال کا اور کہیں قرآن کی آیتوں کا پورا پورا ترجمہ کر دیا ہو۔ روز جزا (قیامت) صراط اور پیغمبران ماسلف کا ذکر بھی ملک محمد نے اپنی کتاب میں کیا ہے اس کے علاوہ تصوف کے اصول پر حاوی ہونے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے فارسی زبان کی کافی استعداد ناگزیر بھی ہے۔

کلام اور تصانیف سے ظاہر ہو کہ ملک صاحب اس زمانے کے اکثر مسلمانوں کی طرح فارسی داں ہی نہ تھے بلکہ ہندوؤں کی روایات اور ویدوں کے متعلق درسی اور خارجی معلومات بھی انہیں نہیں پیدائیں۔ دیکھ کر قیاس ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں اور گروہوں سے ان کا میل جول بھی تھا۔ اور ان کی صحبت سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔

(۱) ایک جگہ پدماوت میں ہے کہ

۱۔ فارسی | پُرش نہ کرے ناری مت کا پچی

ترجمہ { مرد عورتوں کے مکر و فریب پر قابو نہیں پاسکتا۔

فارسی کی تصنیف (سکندر نامے) میں بھی بعینہ اسی خیال کو ادا کیا ہے۔ یعنی آدمی عورتوں سے تریاچہ تر پر قابو نہیں پاسکتا مثال اس کی یہ ہے کہ جب نوشاہ نے دیکھا کہ سکندر کا مقابلہ بے سود ہو تو اپنی طاقت کا خیال دماغ سے نکال کر اس کی ٹونڈی بن گئی۔

(۲) علاؤ الدین کی چڑھائی کا ذکر کرتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد کا آسمان پر چھا جانا ملک صاحب یوں بیان فرماتے ہیں۔
(پداوت) سست کھنڈ دھرتی بھٹے شت کھنڈا

او پر است بھٹے بر مھنڈا

یہ شاہنامہ فردوسی کے اس شعر کا جوں کا تو میں ترجمہ کیا ہے۔
زسم ستوراں دراں پہن دشت زیں شش شد و آسماں گشت ہشت
ترجمہ { اُس لمبے چوڑے میدان میں گھوڑوں کی ٹاپوں سے طبقاتِ
زمین بجائے سات کے چھو رہ گئے۔ اور آسمان سات کے بجائے آٹھ ہو گئے

(۳) دوسرے متن سین کا پیغام تو تاجا کر یوں پہنچاتا ہے۔

(پداوت) دہوں جیور ہے کہ میرے، کاہ رجائیں ہوئے
یہ فارسی کے اس شعر کے بالکل متوارد ہے۔

عزم دیدار تو دارد جان بر لب آمدہ

باز گردد یا بر آید چسیت فرمان شما

ترجمہ { جان تمہارے دیکھنے کے ارادے سے ہونٹوں پر آگئی ہو اب کیا
حکم ہو نکل جائے یا رہے۔

सत-खंड भरती भइ षट खंडा । १

ऊपर अस्त भए बरहण्डा ॥

۲۵ مسلمانوں کے روایات کے مطابق زمین و آسمان کے طبقات سات ہیں۔

दृष्टं जित रई कि नी सरै काह रजायसु होई ॥ २६

۲۔ فارسی ضرب الامثال | (۱) ایک مقام پر ملک صاحب فرماتے ہیں۔

(پداوت) تیر ہیں دُور، پھول جس کاٹا

دُور ہیں نیر سو جس گڑا چاٹا

ترجمہ { نزدیک رہتے ہوئے بھی دُوری ہو سکتی ہو جیسے پھول اور کاٹا کہ آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور دُور ہونے پر بھی قربت ہو جاتی ہو جیسے گڑ اور چیونٹا کہ الگ الگ ہیں مگر مل جاتے ہیں۔

(فارسی) دُوراں باخبر نزدیک نزدیکوں بے بصر دُور

(۲) دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

(پداوت) پرہیز پریم نہ آچھے چھپا۔

ترجمہ { خوشبو اور محبت چھپائے سے نہیں چھپتی۔

(فارسی) عشق و مشک را نتواں نہفت۔

ترجمہ { عشق و مشک کو چھپا نہیں سکتے۔

۳۔ عربی | کئی مقاموں پر ملک محمد نے قرآنی آیتوں کا ترجمہ نہایت صفائی کے ساتھ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف

عبارت قرآنی کی تلاوت ہی پر دوسرے مسلمانوں کی طرح قادر نہ تھے بلکہ اس کے مطالب و مسائل پر بھی کافی عبور رکھتے تھے اس سے یہ نتیجہ صریح نکلتا ہے کہ ان کو عربی سے کافی واقفیت تھی۔

نیراہی دُور، فُل جاس کاٹا ।

دُورہی نیر سہی جاس گڑا کاٹا ॥

پرہیز پریم نہ آچھے چھپا ।

پداوت میں جو نعت کہی ہو اس کے شروع ہی میں فرماتے ہیں۔
 پر تقم جوت بدھ تا کر ساجی اوتیہی پر ریت سہت اُپراجی
 رجمہ { پہلے اللہ تعالیٰ نے نور اُسی کا سنوارا اور پھر اس کی محبت سے
 سارا عالم پیدا کیا۔

یہ مضمون رسول کی اس حدیث سے لیا گیا ہے جس میں اُنھوں نے
 اپنے متعلق کہا ہے۔ کہ
 "أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُودِي وَأَنَا مِنْ نُورِ اللَّهِ وَكُلُّ شَيْءٍ مِنْ نُورِي"
 یہ تو یہو حدیث کا ترجمہ — قرآن کی آیتوں کا ترجمہ بھی ملاحظہ ہو
 سی پداوت میں بعد حمد کے فرماتے ہیں۔

نا اودہ پُت نہ پیتا نا ماتا
 نا اودہ کُٹنب نہ کوئی سنگ ناتا

رجمہ { نہ وہ کسی کا بیٹا ہو نہ کسی کا باپ نہ کسی کی ماں۔ نہ وہ کسی کا
 نوہ نہ رشتے دار — اسے پڑھیے اور پھر قرآن کی سورہ اخلاص، تو
 معلوم ہو جائے گا کہ اس کا ماخذ "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَكَ
 فَوْلاً أَحَدٌ" ہے۔

رجمہ { نہ اس کے کوئی اولاد ہو اور نہ وہ کسی کی اولاد ہو نہ اس کا کوئی
 سر یا رشتے دار ہو۔

۱۔ प्रयम जोति बिधि ताकर साजी ॥

औ तेहि प्रीति साहूत उपराजी ।

२۔ ना ओहि पुत न पिता ना माता ॥

न ओहि कुटुंब न कोइ संग नाता ।

ایک جگہ اور حمد ہی میں فرماتے ہیں:-
 (پداوت) کینفس لے مانش دہس بڑائی
 کینفس اَن بھگت تہہ پاتی

ترجمہ { آدمی کو پیدا کیا اور اُسے شرف دیا غلہ پیدا کیا اور اس سے
 رزق عطا کیا۔ یہ وہی آیت "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" ہو جس کی طرف
 اشارہ ہو۔

ترجمہ { اور ہم نے اولاد آدم کو عزت دی۔
 پداوت کی اس سطر میں کہ

چھارہیں تے سب کینفس مین کینفس سب چھارہ
 ترجمہ { مٹی سے سب کچھ پیدا کیا اور بعد کو سب مٹی ہی میں ملا دیا۔

قرآن کی کئی آیتوں کا مضمون پایا جاتا ہو۔ سورہ حج کی ایک
 آیت میں ہو فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ
 ترجمہ { تو ہم نے تم کو مٹی سے بنایا۔

اور سورہ مومنون میں آیا ہو
 "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلْسَلَةٍ مِنْ طِينٍ"
 ترجمہ { اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے بنایا۔

کینھس مانوष दिहेसि बड़ाई । १
 किनहेसि अन्न, भुगुति तेहि पाई ॥

छारहिं ते सब किनहेसि । २
 पुनि किनहेसि सब छार ॥

اور سورہ ظہ میں تو لفظ بہ لفظ یہی موجود ہے۔

”مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى“

ترجمہ { ہم نے انسان کو مٹی سے بنایا اس کو اسی مٹی میں ملا دیں گے
آخر اسی مٹی سے نکالیں گے۔ یہ اور اسی قسم کی اور آیتیں بھی ہیں جو ان
کے کلام میں ترجمے کی صورت میں ملتی ہیں لیکن یہ ترجمے صرف حمد و نعت
اور منقبت کے ذیل میں ملیں گے۔

۴۔ سنسکرت | گری سرسن صاحب نے ”سدھا کر چندریکا“ کے دیباچے
میں لکھا ہے کہ جاسی میں آکر ملک محمد نے سنسکرت عروض
اور زبان کی واقفیت پنڈتوں سے حاصل کی لیکن اس کا کوئی ثبوت
گری سرسن صاحب نے پیش نہیں کیا۔

ملک محمد صاحب کی نظم سے تو ان کی سنسکرت جاننے کا کچھ پتہ نہیں
چلتا کیونکہ الفاظ جو ان کی سنسکرت دانی کا ثبوت دیں۔ اول تو کم ہیں اور

Sir George Grierson

I. C. S. لے سر جارج گری سرسن (آئی سی ایس)

ایک بڑے شہسرق ہیں اور آپ کا شمار ہندی ادب کے ممتاز ارکان میں کیا جاتا ہے۔

بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی Asiatic Society of Bengal

نے ان کے اور سدھا کر جی ”مہا مہوپا دھیا“ کے سپرد یہ خدمت کی تھی کہ یہ دونوں
پداوت کا ترجمہ انگریزی اور ہندی نشریں کریں مگر افسوس کہ سدھا کر جی کی موت
نے اس کام کو مکمل نہ ہونے دیا۔ گری سرسن صاحب نے اس کتاب کا دیباچہ انگریزی
میں لکھا ہے جس میں ملک صاحب کی کچھ سوانح زندگی بھی دیے ہیں۔ سدھا کر جی نے
ہندی میں ترجمہ کیا ہے کتاب کا نام اسی وجہ سے ”سدھا کر چندریکا“

جو ہیں وہ بھی ایسے جن سے ہر ہندی پڑھا لکھا شخص واقف ہوتا ہو اگر ملک محمد سنسکرت سے کافی واقف ہوتے تو ایک ہی لفظ کو بار بار استعمال کرنے کے بجائے اس کے مترادف سنسکرت کے الفاظ لاکر مزید فصاحت کا ثبوت دیتے اور ایک ہی لفظ کی تکرار نہ کرتے۔ مثال کے طور پر چند ایسے الفاظ لیجیے جنہیں جاسی نے اتنی مرتبہ استعمال کیا ہو کہ طبیعت گھبرا جاتی ہو اور جن کے مترادف الفاظ سنسکرت میں بہت ہیں تو تھے (سوا) کے لیے ملک صاحب نے ”روی“۔ ”پہانو“۔ ”دھکر“ سورج اور چاند کے لیے ”سسی“۔ ”سس ہر“ اور ”میتک“ ہی لکھا ہو حالانکہ ان کے مترادفات کثرت سے سنسکرت میں موجود ہیں جو فصیح بھی ہیں اور رایج بھی۔ یہ درست ہو کہ بعض الفاظ خود ایسے ہوتے ہیں اور بعض دوسرے الفاظ سے مل کر ایسے ہو جاتے ہیں کہ ان کے بجائے دوسرا لفظ لانے سے بھونڈاپن پیدا ہو جاتا ہو۔ خواہ وہ الفاظ کسی دوسرے موقع پر کتنے ہی فصیح کیوں نہ ہوں ایک بہت عام مثال اس کی میر صاحب (میر انیس) کے مرثیے کا مصرع

”کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا“ جس میں ”اوس“ کے لفظ نے وہ لطف دیا ہو جو فصیح تر مترادف الفاظ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہو کہ ”اوس“ کی بھرا کر دی جائے اور مرثیہ ”اوس“ سے ترتر دکھائی دینے لگے۔ رہ گیا اس نظم کا اسلوب سواول تو شاعر کا اسلوب بیان وہی ہوتا ہو اور اگر اکتسابی مان لیا جائے تو بھی یہ پنڈتوں کے بجائے شاعروں سے اخذ کیا گیا ہو گا چونکہ پداوت سے پہلے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی جا چکی تھیں اسی طرح ممکن ہو کہ ”کوئی ریت“ بھی انھوں نے

لے مانوڈ از جاسی گر نتھاولی مصنفہ پنڈت رام چند شکل۔

کسی شاعر سے سیکھی ہو۔

پدماوت میں دیز (سوج) دینیاہر سس ہر (چاند) سسہر
آہٹ (آٹھ) آہٹ بھول (راجا) بھول (راجا) بھول
پھوی (زمین) پھوی (زمین) پھوی
سیرنگھی (درویدی کا دوسرا)

نام، گنگیو، بھیشم کا نام، پراٹھ (ارجن کا نام) جیسے الفاظ کے استعمال سے بھی گری یسن کے قول کی قطعی تائید نہیں کی جاسکتی ممکن ہو کہ ان الفاظ کا استعمال محض معلومات خارجی کا رہین منت ہو جیسا آج کل صدہا عربی اور سنسکرت سے بے بہرہ لوگ ہزار ہا عربی اور سنسکرت کے الفاظ محض سن کر یا دوسری زبانوں کی کتابوں میں مستعمل دیکھ کر جان گئے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔

ایک اور بات بھی ملک محمد جانیسی کی سنسکرت دانی کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہو یعنی یہ کہ اکثر سنسکرت کے اشلوکوں کے مضامین ان کے اشعار میں موجود ہیں جن کے متعلق توارکا حکم مشکل سے لگایا جاسکتا ہو۔ مثلاً پدماوت میں یہ دوہا

بھنور جو پاوا کنول کہنہ من چیتا بہوکیل
آئے پرا کوئی ہست تنہ جو رکیو سوبیل

بھنور جو پاوا کنول کہنہ، من چیتا بہوکیل ۱

آہ پرا کوئی ہست تنہ، جو رکیو سوبیل ۱۱

(پدماوت)

سنسکرت کے اشلوکوں سے مانوہ معلوم ہوتا ہو جس کا مطلب یہ ہو بھنورا جو کہیں کنول کو پاتا ہو خوب جی بھر کر اس میں رہتا ہو کسی ہستی

نے اس کنول کو توڑ دیا وہ بھی اس کے ساتھ مر گیا۔

چانک کے ایک اشلوک کا ترجمہ بھی پڑاوت میں موجود ہو ملاحظہ ہو۔
 نقل نقل بگ نہ ہو ہیں، جیہ جوتی جل جل سیپ نہ اُنھیں موتی
 بن بن برکش نہ چندن ہوئی تن تن ورہ نہ اپنے سوئی

(پڑاوت)

ترجمہ { ہر زمین میں چکدار جواہر نہیں ہوتے اور ہر پانی کی سیپ موتی پیدا نہیں کرتی ہر جنگل میں چندن کے پیڑ نہیں ہوتے اسی طرح ہر آدمی کو جدائی نہیں ستاتی۔ لیکن اس قسم کے خیالات بھی انھیں بھاشا کے شاعروں کے وساطت سے مل سکتے تھے پس یہ بھی ان کی سنسکرت دانی کی دلیل قطعی نہیں ہو سکتی۔ کم سے کم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سنسکرت اور ”کوئی ریت“ انھوں نے جاس ہی میں سیکھی کہیں سیکھی ہو سیکھی ضرور اور بڑبڑتوں ہی سے سیکھی۔

۵۔ بھاشا اور سنسکرت | جہاں سنسکرت دانی میں یقین کے قرائن نہیں وہاں اس میں شک کی گنجائش بھی

لے چانک کے سنسکرت اشلوک کا ترجمہ یہ ہو۔

ہر پہاڑ میں جواہرات نہیں ہوتے۔ ہر پانی میں موتی نہیں ہوتا۔ ہر جنگل میں چندن نہیں ہوتا اسی طرح سب جگہ سادھو نہیں ہوتے۔

थल थल नग न होहिं जिह जो ती । ८

जल जल सीप न उपनहिं मोती ॥

बन बन वृक्ष न चंदन होई ।

तन तन विरह न उपनसोई ॥ (पदमावत)

نہیں کہ ان کو بھاشا اور پرکرت میں استعداد کامل تھی ایسی استعداد کہ پداوت جیسی داستان نظم کر ڈالی پداوت جس میں بقول حضرت آزاد دوسری زبان کا لفظ صفحے کے صفحے اُلٹ جائیے نہ ملے گا اور جو تھوڑے سے الفاظ غیر زبانوں کے کہیں کہیں ہیں اُن سے ادب اُردو اور ہندی کے ارتقا اور علیحدگی کا پتہ چلتا ہے۔

۶۔ عروض | معلوم ہوتا ہے کہ عروض سے ملک صاحب بخوبی واقف نہ تھے کیونکہ اول تو اپنی نظم چو پائی - دوہے میں لکھی ہے جو ہندی اقسام نظم میں سب سے سہل سمجھی جاتی ہے اور پھر اس میں بھی عروض کی غلطیاں پائی جاتی ہیں عروض کی یہ ناواقفیت بھاشاکے اکثر متقدمین میں دیکھی جاتی ہے گسائیں تلسی داس جی کی شاعری بھی عروض کے عیوب سے خالی نہیں۔

۷۔ ویدانت اور پران | ویدانت کے کئی باتوں کی جھلک پداوت میں پائی جاتی ہے جسے ہندو سادھوؤں اور مہاتماؤں کا فیض صحبت سمجھنا چاہیے۔ پداوت کے مطالعے کے بعد پنڈت رام چندر شکل کی رائے ہے کہ پرا نوں کے متعلق ملک محمد کو معلومات تھی مگر ناکافی وہ یہ جانتے تھے کہ ”کبیر“ کا مقام ”لکا پوری“ ہے کیونکہ وہ بادشاہ کی بھیجی ہوئی ”یوگنی“ سے کہلواتے ہیں ”گیوں“ الک پور جہاں کبیرو۔ لیکن اندر کے مستقر کو جو کہ ”سورگ“ (جنت) ہے اس کو وہ ”کیلاش“ ہی کہتے ہیں۔ شکل جی ایک جگہ تو یہ

فرماتے ہیں اور دوسری جگہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ملک صاحب ”سورگ“ کو ہمیشہ آسمانوں کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ جب یہ تسلیم ہو کہ ”سورگ“ کے معنی ملک صاحب نے اپنی تحقیق یا سہو کی رؤ سے آسمان کے قرار دے لیے تھے تو سورگ کو اندر کا مستقر لکھنا پران سے ناواقفیت کا ثبوت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اندر کا مقام آسمان نہیں بلکہ بہشت ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ کیلاش سے ان کی مراد ہمیشہ بہشت تھی اور وہ اس سے ناواقف نہ تھے کہ اندر کا مقام بہشت ہے۔
شکل جی فرماتے ہیں۔

”پرائوں^۱ میں سات جزیروں اور سات سمندروں کا ذکر آیا ہے، ملک محمد نے جزیروں کے نام تو نہیں لیے ہیں ہاں سات سمندروں کے گنوانے کی ضرورت انھیں سمندر کے بیان میں ہوتی ہے۔ ان میں دو نام ”ملکا“ اور ”مانسر“ پرائوں کے مطابق نہیں ہیں۔ پرائوں میں ایک ہی مانسر یور شمال میں مانا گیا ہے لیکن ملک محمد نے اسے سنہل کے پاس بتایا ہے حالانکہ یہ جھیل ہے مگر اس کو بھی سات سمندروں میں گن لیا ہے اس کے علاوہ ہندو قصوں کا اگر پورا پورا علم ہوتا تو وہ چاند کو موٹ نہ لکھتے“

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے شکل صاحب کا بیان حرف بہ حرف درست ہے مگر محض سات ناموں سے دو کا غلط ہو جانا یا سمندر کو جھیل کہ جانا حافظے کی غلطی سے بھی ہو سکتا ہے اور ضرورت شعری سے بھی

۱۔ عروض۔ ویدانت اور پران وغیرہ کے متعلق بیشتر معلومات رام چندر شکل کی جاسی گرتھاولی سے ماخوذ ہیں۔

بعض اوقات حافظے کے اعتبار پر غلطیاں ہر شخص سے سرزد ہو جاتی ہیں۔ رہا ملک صاحب کا چاند کو مونث لکھنا سو اس کی تو جیہہ خود شکل جی نے کر دی ہو یعنی یہ کہ شاعر جاسی نے ایسا ان اقوال کے زور پر کہا ہو جس کی بنا پر اودھ میں ”چندامیا“ (MOTHER MOON) کہتے ہیں۔ لیکن یہ تو جیہہ ملک صاحب کی فروگزاشت سے بھی عجیب تر ہو۔ اس لیے کہ اودھ تو بڑا خطہ زمین ہو خود جاس میں جہاں ملک صاحب نے نظم لکھی ہو چاند کو ”چنداماموں“ (UNCLE MOON) کہہ کر بچوں کو پہلاتے ہیں البتہ ممکن ہو کہ ملک صاحب کے یہاں چاند کی تانیث عربی زبان سے ماخوذ ہو کیونکہ عرب میں چاند بہ اعتبار اپنے حسن اور نرمی و خوشگواری نور کے مونث بولا جاتا ہو۔

۸۔ رامین اور مہابھارت | مہابھارت اور رامین کے مشہور واقعات اور روایات کے متعلق

یہ کہنا کہ شاعر جاسی کو ان کا علم خوب تھا اور ان کی یہ معلومات بہت زیادہ تھی غیر ضروری ہو کہ یہ کارنامے تو وہ ہیں جو ایک طرف اہل وطن کا سرمایہ افتخار اور دوسری طرف اہل مذہب کے لیے خضراہ ہیں۔

۹۔ جغرافیہ | علم تاریخ اور جغرافیہ کے معاملے میں ہندستان کے پرانے زمانے کے لوگ طفل مکتب تھے ایسے وقت میں اپنے

شہر کے مختلف مقامات کے متعلق بھی اگر تھوڑی بہت معلومات ہوتی تو اسے بہت سمجھتے چہ جائیکہ ملک کے مختلف حصوں اور باہر کے ملکوں کی واقفیت جن سے اہل ہند کے قطع تعلق کو مدتیں گزر چکی تھیں سنہل دیپ اور لکا کے بس نام ہی نام یاد رہ گئے تھے اسی حالت میں اگر کسی کو سنہل کے

محل وقوع کا ٹھیک ٹھیک علم نہ ہو تو کوئی مقام تعجب نہیں جاسی نہل دیپ کو پورب سمجھتے تھے اور لنکا کو وہ سنہل کے دکن میں مانتے تھے۔

یہ بات نظم کے اُس حصے کو غور سے پڑھنے سے ظاہر ہو جاتی ہے جس میں سنہل سے پلٹتے وقت طوفان میں بہ کر تن سین کے جہاز کے غارت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ملک محمد اس مقام پر لکھتے ہیں کہ جہاز آدمی سمندر میں بھی نہ آئے تھے کہ اُتر کی ہوا بڑے زور سے اُٹھی اس طوفان کی وجہ سے جہاز راہ بھول کر لنکا کی طرف چل پڑے۔ اُتر کی طرف آندھی آنے پر جہاز دکن ہی کی طرف جائیں گے۔ اس طور سے لنکا دکن ہوا لیکن صرف اس غلطی کی بنا پر ملک صاحب کو جغرافیہ اور تاریخ سے بے بہرہ نہیں کہا جاسکتا ان کی واقفیت کا ثبوت اور باتوں سے بخوبی ملتا ہے:-

خلیج بنگال سے بحر الکاہل ہوتے ہوئے جو جہاز چین تک جاتے تھے تملوک (واقع ضلع میدنا پور صوبہ بنگال) اور کالنگ کی بندرگاہیں انھیں راستے سے ملتی تھیں۔ چنانچہ فاہیان نام کا ایک چینی سیاح تملوک ہی سے جہاز میں بیٹھ کر چین واپس گیا تھا۔ یہی راستہ ملک صاحب نے

آاधे समुद्र ते आए नाहीं ।

उठी बाउ आंधी उतराहीं ॥

बोहित चले जो बितर तारके ।

भय कपथ लंक दिसि हाके ॥

(पदमावत)

ۛ فاہیان راجہ چندر گپت کے زمانے میں ہندستان آیا تھا۔

پدماوت میں لکھا ہے۔ اڑیسہ کے دکھن کالنگ میں "کنگ پٹن" نام ایک بڑا نا شہراب بھی سمندر کے کنارے بسا ہوا ہے۔ جزیرہ بالی اور "لنگ" کے ہندو اپنے کو کالنگ ہی سے آئے ہوئے بتاتے ہیں۔ ملک صاحب ایک جگہ اور فرماتے ہیں:-

آگے پاؤ اڑیسہ پائیں دسے سوباٹ
دھناورت دیئے کے اتر سمندر کے گھاٹ (پدماوت)
یہ معلومات یہیں تک نہیں ختم ہو جاتی بلکہ پوربی سمندر کی بہت سی خصوصیات بھی ملک صاحب کو معلوم تھیں مثلاً بحر الکاہل کے جنوبی حصے میں مونگے سے بنے ہوئے بہت سڑاپودوں میں کہیں کہیں مونگوں کی تہ پر تہ جمتے جمتے ٹیلے بن جاتے ہیں۔ کافور نکالنے والے پیڑ بھی اس سمندر کے جزیروں میں بکثرت ہیں ایسی خصوصیات کا پرانے زمانے کے مسافروں کو خاص طور پر خیال رہتا ہوگا چنانچہ پدماوت میں بھی اس کا ذکر ہے۔

راجا جائے تھاں بہ لاگا جہاں نہ کیفہ سندھیا کا سا
تھاں ایک پر بت او ڈولگا جہہ واں سب کپور او مونگا

۱۔ آگے پاو ڈھیسا، باएं दिए सो बाट ।

वहिना वरत वहकै, उतरु समुद्र के बाट ॥

۲۔ "سمندر کے گھاٹ" سے مراد کنگ کا بندرگاہ ہے۔

۳۔ राजा जाइ तहां बहि जागा ।

जहां न कीन्ह संदेसा कागा ॥

तहां एक परवत ग्रह हूंगा ।

जह्वां सब कपूर ओ मूंगा ॥

(पदमावत)

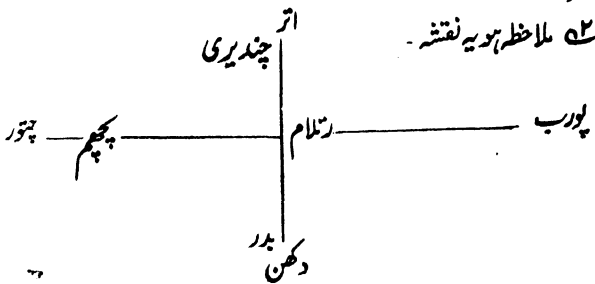
ملک محمد نے چتور سے سنہل جانے کا جو راستہ بیان کیا ہو گودہ زیادہ مفصل نہیں ہو لیکن اس سے دکن خاص کر مالک متوسط کے مقاموں کا علم ظاہر ہوتا ہو۔ چتور سے رتن سین مشرق کی طرف چلتا ہو کچھ چلنے پر جاسی کہتے ہیں۔

دلہنے بدر باتیں چندیری

رتن سین چتور سے مشرق کی طرف چلا اور رتلام کے پاس آنکلا جہاں سے چندیری باتیں یا شمال کی طرف اور بدر جنوب کی جانب پڑے گا۔ رتلام سے وجر گڑھ (جو صوبہ مالوہ کا دارالسلطنت تھا) ہوتے ہوئے اندھیار کھولا کو باتیں یا اتر طرف چھوڑتے ہوئے گونڈوں کے ملک گونڈوانے میں پہنچ کر کہتا ہو۔

لہ چندیری آج کل ریاست گوالیار میں شامل ہو اور لت پور سے مغرب کی طرف واقع ہو اور بدر (برار کے قریب) دکن میں۔

آئین اکبری میں صوبہ برار کے شمال جنوب ہندیا (مگدھ کے قریب میں زبدا کے کنارے ایک چھوٹا قصبہ) سے بدر تک ۸۰ کو س لکھا ہو اور برار کے دکن تلنگانا بتایا گیا ہو۔



۱۶ ہوشنگ آباد اور ساگر کے درمیان کے شہر۔

سنومت کاج چہس جو ساجا
بیجا نگر بکر گڑھ راجا
پہنچو جہاں گونڈ او کولا
تج بائیں اندھیار کھٹولا (پداوت)

ملک صاحب کی بیان کی ہوئی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ رتن سین
زلام کے پاس چکد اندور کے دھن نربدا کے کنارے ہوتا ہوا ہنڈیا
یا (ہردوار) کے پاس نکلا جہاں سے پورب جانے والے کو ہوشنگ آباد
اور ساگر کے درمیان کے شہر (اندھیار کھٹولا) اُتر یا بائیں طرف پڑے گا۔
جب گونڈوں کے ملک میں پہنچو تو اندھیار کھٹولا کو بائیں طرف چھوڑ دو۔
ہنڈیا برار کے اُتری حصے میں تھا اور برار کے دھن تلنگانا ملک مانا جاتا
تھا (جو آج کل کے برار کا بھی دھنی حصہ ہے) ہنڈیا کے شمال جبیلور پڑے گا
جس کے پاس گڑھ کٹنگ تھا۔ اس لحاظ سے ہنڈیا کے پاس شک راجا کا
یہ کہنا بہت ہی ٹھیک ہے — کہ

ل
रतु मत, काज बहिस जो साजा ।
बीजा नगर बिजयगढ़ राजा ॥
पहुंचहु जहां गोब ओ कोला ।
तजि बाएँ अंधियार खटोला ॥

(पदमावत)

بیجا نگر اندور کے دکن نربدا کے دونوں طرف پھیلی ہوئی
سلطنت ہے۔

دکھن دھن رہیں تلنگا اُتر بائیں گڑھ کا ٹنگا
 مانجھ رتن پور سنہ دوارا جھار کھنڈ دیتے بانون پہاڑا
 رتن پور سے پھر شک راجا سرگی کا جنگل (جھار کھنڈ) اُتر چھوڑتے
 ہوئے آگے پڑھنے کو کہتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ اگر برابر آگے بڑھتے
 جاؤ گے تو اڑیسہ میں پہنچ جاؤ گے اس لیے اس راجا پر کچھ دُور
 چلنے کے بعد اڑیسہ جانے والے راستے کو چھوڑ کر دکھن کی طرف
 گھوم پڑنا۔ دکھن پہنچنے پر ملک کا لنگ ہے اور اس سے گزر کر سمندر کا
 گھاٹ (یعنی کلنگ کا بندرگاہ) ملے گا۔

آگے پاؤ اڑیسہ بائیں دیہ سوباٹ دہنا ورت دے کر اُتر سمندر گھاٹ
 اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاسی نے چتور سے کلنگ تک
 جانے کا جو راستہ لکھا ہے وہ یوپی اٹکل پتچہ نہیں ہے بلکہ یہ مقامات اب
 بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُسی طرح واقع ہیں جیسے کہ بیان
 کیے گئے۔

اس کے علاوہ شاعر جاسی کو دُور دُور کے مقاموں کے نام

لے दखिखन दहिने रहहिं तिलङ्गा ।

उत्तर बाएँ गढ़ काटंगा ॥

मौफ रतन पुर सिंह दुवारा ।

कार खंड देह बाव पहारा ॥

۷۷ یہاں پر ضرورت شعری کی وجہ سے سنہ دوارا (جھنڈ وارہ) کے
 پہلے رتن پور کہا ہے حالانکہ ہنڈیا سے پورب جانے والے کو پہلے جھنڈ وارہ پڑے گا
 تب رتن پور جو ضلع بلاسپور میں واقع ہے۔

بھی معلوم تھے۔ بادشاہ کی طرف سے جب ایک عورت جاسوس بن کر چتور گئی ہو اس نے جہاں اپنے تیر تھوں کا ذکر کیا ہو وہاں بہت سی تیر تھ گاہوں کے نام گنائے ہیں جن میں سے کچھ تو بہت مشہور ہیں لیکن کچھ ایسے غیر معروف نام بھی آئے ہیں جنہیں اس طرف (یعنی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ) کے لوگ کم جانتے ہیں مثلاً نگر کوٹ^۱ اور بال ناتھ کا ٹیلہ^۲ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ملک محمد نے جغرافیہ کی کتنی غلطیاں کی ہیں لیکن ان کی معلومات رسم و رواج زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے بہت تھی بلکہ بعض مقامات کی تو ایسی تفصیلات اُن کو معلوم تھیں جو کسی واقف کار ہی کو ہو سکتی ہیں۔

۱۔ نگر کوٹ کا نگرے میں ہو جہاں لوگ جوالا دیوی کی زیارت کی غرض سے جاتے ہیں۔

۲۔ بال ناتھ کا ٹیلہ بھی پنجاب میں ہو۔ سندھ اور جہلم کے درمیان جونک کے پہاڑ پڑتے ہیں اسی کے اندر یہ ایک اونچی پہاڑی ہو جس میں بال ناتھ نام ایک جوگی کی کٹی ہو۔ یہاں سادھو کثرت سے جاتے ہیں۔

مرزا پور میں بھی اس نام کی ایک کٹی ہو لیکن غالباً جاسی کا مطلب پنجاب والی کٹی ہی سے ہو گا کیونکہ اس کی اہمیت مرزا پور والی کٹی سے کہیں زیادہ ہو۔

پنجاب والے بال ناتھ کے ٹیلے کا ذکر آئین اکبری میں صوبہ لاہور کے بیان کے سلسلے میں بھی آیا ہو۔

۱۰۔ تاریخ | ملک صاحب کی تاریخی معلومات جغرافیہ کے علم سے زیادہ تھی اور اس کا ثبوت خود پدماوت ہے۔

یہ درست ہے کہ پدماوتی اور ہیرامن توڑنے کی کہانی ہندستان اور خاص کر اودھ میں بہت مشہور ہے اور پدماوت کی کہانی اسی کے مطابق ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کہانی کہنے والے راجا اور بادشاہ کا نام نہیں لیتے اس کے بجائے غیر متعین طور پر ”ایک راجا تھا“ یا ”ایک بادشاہ تھا“ کہتے ہیں اور ملک محمد جاسی نے نام لے کر کہانی میں تاریخی جان ڈال دی ہے۔ زمانہ گزرنے سے کہانی تاریخ اور تاریخ کہانی ہو جاتی ہے۔ یہی حال پدمنی کے قصے کا ہوا۔ اس قصے میں چتور، رتن سین، علاؤ الدین اور گورابادل وغیرہ ناموں کا استعمال شاعر جاسی کے اس علم کا یقین دلاتا ہے کہ یہ واقعہ کس بادشاہ کے زمانے اور کس مقام کا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پدمنی کس کی رانی تھی اور کس راجپوت نے لڑائی میں سب سے زیادہ جواں مردی کا اظہار کیا تھا اس کے علاوہ علاؤ الدین کی اور لڑائیوں کا بھی پتہ اُن کو تھا۔ مثلاً دیوگری کا حملہ اور قلعہ رنٹھبور کا محاصرہ۔ تاریخی اعتبار سے اُن سب حملوں کا اور لڑائیوں کا ذکر نظم میں نہایت عمدگی کے ساتھ ہوا ہے علاؤ الدین کے عہد میں مغلوں کے کئی حملے ہوئے تھے

۱۔ دیوگری پر علاؤ الدین نے ۱۲۸۲ء میں حملہ کیا تھا جو اُس کے چچا سلطان جلال الدین کا عہد تھا۔ قلعہ رنٹھبور پر اُس نے بادشاہ ہونے کے چار سال بعد ۱۲۸۵ء میں چڑھائی کی تھی لیکن اس مرتبہ وہ اسے نہ لے سکا۔

تھا۔ دوسرے سال ۱۳۰۱ء میں قلعہ فتح ہوا اور مشہور سپہ سالار ”ہمیر“ مارا گیا۔ یہ دونوں حملے چتور کی فتح سے پہلے کے ہیں جو ۱۳۰۲ء میں ہوئی۔

جن میں سب سے زبردست حملہ ۳۰۲ء میں ہوا۔ یہی سال تھا جبکہ علاؤ الدین نے چتور پر چڑھائی کی تھی اب ملاحظہ فرمائیے مغلوں کے اس حملہ کا ذکر جالسی نے کس طرح کیا ہے۔

یہ دودھ ڈھیل دینھ تب تائیں دلی تیں ارداسیں آئیں
پچھیوں ہر دے دینھ جو پیٹھی سواب چڑھا سونھ کے دھٹی
جنھ بھوئیں ماتھ لگن تمیم لاگا تھانے اٹھے، آو سب بھاگا
اُہاں ساہ چتور گرٹھ چھاوا اہاں دیس اب ہوئی پراوا
ترجمہ { اس لڑائی میں اس طرح ڈھیل پڑی کہ دلی سے عرضداشتیں آنے لگیں کہ مثل جو ہمیشہ بھاگتے تھے اب انھوں نے چڑھائی کی تھانی
ہو جس کا سر ہمیشہ زمین پر رہتا تھا اس نے سر اٹھایا ہو شاہ نے تو
وہاں چتور میں چھاوونی ڈالی ہو اور یہاں اپنا ملک غیر کا ہوا جاتا ہو۔
راجپوتوں کے مختلف خاندانوں کے بہت سے نام ان کو

पहि विधि ढील दीन्ह तब साइं ।
दिल्ली तें अरदासैं आईं ॥

पछिउं हरवे दीन्हि जो पीठी ।
सो अब चढ़ा सौहं कै दीठी ॥

जिन्हू भुंह माथ गगन तहि लागा ।
आने उठे आव सब भागा ॥

उहां साह चित वर गढ़ छाबा ।
इहां देस अब होइ परावा ॥ (पदमावत)

۳ ملک صاحب نے مغلوں کے ملک کا نام ”ہروے“ رکھا ہے۔

معلوم تھے لیکن ان کو اس کا ٹھیک علم نہیں تھا کہ کس خاندان کا راجا کس جگہ حکومت کرتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ رتن سین کو چوہان نہ لکھتے کیونکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ چتور میں راول کے وقت سے اب تک ششودھیا کی حکومت ہے۔ نہ کہ چوہانوں کی۔

۱۱۔ نجوم | پدمات میں تاریخ، جغرافیہ، عربی، فارسی وغیرہ کے علاوہ کچھ ایسی باتوں کا بھی ذکر آیا ہے جو علم کیمیا، علم نجوم، جنسی معلومات اور دیگر علوم سے متعلق ہیں مگر عنوان بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام علوم میں تو ان کو کافی دستگاہ نہ تھی البتہ علم نجوم میں انھیں خاصی مہارت تھی۔

رتن سین کے سہیل دیپ روانہ ہونے سے پہلے تاریخ کی نحوست اور سعادت کے متعلق جو نقشہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ مفصل بھی ہے اور علم جوتش کے مطابق بھی۔ ان کی اس مقام کی اکثر چوپائیاں زباں زد عام ہیں۔

پدمات۔ سوم سینچر پرب نہ چالو منگل بدھ اتر دس کالو ترجمہ { دوشنبہ اور ہفتے کو پورب کی طرف نہ جانا چاہیے اور سہ شنبہ اور چار شنبہ کو اتر کی طرف جان کا خطرہ ہے۔

لہ رتن سین کو جب سولی دینے کے لیے جاتے ہیں تب بھاٹ اس کا تعارف راجہ گندھ سین سے اس طرح کرتا ہے۔

جنو بوب چتور گرھ دیبا چتر سین بڑھائے زریا
رتن سین یہ تا کر بیٹا کل چوہان جاتے نامیٹا
ترجمہ { ہندستان میں چتور گرھ ایک مقام ہے چتر سین وہاں کا ایک بڑا حاکم تھا یہ رتن سین اسی کا بیٹا ہے چوہان خاندان مٹا نہیں جاسکتا۔

سونا سونو بار پورب ن چالو ॥
منگل دس اتر دس کالو ॥

علم نجوم کے عربی، فارسی ناموں کے مترادف ہندی الفاظ بھی اُن کو معلوم تھے جو مشکل بات ہے۔ پد مادت میں ستارہ سہیل کا ذکر انھوں نے ”سہیل“ یا سہیل کے نام سے اکثر مقاموں پر کیا ہے اور انھیں مواقع پر کیا ہے جس پر ہندی شاعری کو ”اگست“ استعمال کرنا چاہتے یعنی بارش کے اختتام اور جاڑے کے شروع کا اظہار۔

مثلاً
بچھرتا جب بھیدے سو جانے جیہ نہیہ
سکھک سہیل اگا وے دکھ جھرے جمی مینہ

اسی طرح ایک مقام پر اور سہیل کا نام استعمال کیا ہے رتن سین کو دلی سے چھڑا کر جب گورا بادل چلا ہے تب شاہی فوج نے اُس کا تعاقب کیا ہے اس وقت گورا کے کہنے سے بادل تو رتن سین کو لے کر چتور کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور گورا سپاہیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پلٹ لے سہیل ایک ستارہ کا نام ہے جس کے نکلنے سے تمام کیڑے مکوڑے مر جاتے ہیں۔ سہیل کا ذکر اردو، فارسی کی شاعری میں اکثر آیا ہے۔

۱۱ ہندی شاعر ”اگست“ سے برسات کے اختتام اور گلابی جاڑے کے شروع کا اظہار کرتے ہیں جیسا کہ تلسی داس نے ایک جگہ کیا ہے۔

اوت اگست پیتھ جل شوشا جمی لو بھیں سوکھے سنتوشا

ترجمہ ستارہ اگست کے طلوع ہونے پر راسنوں کا پانی خشک ہو گیا اسی طرح جیسے حرص اطمینان کو فنا کر دیتی ہے۔

۱۲
बिहरंता जब मेदेतसो जाने जि हिनेह ।

सुखस-सुखेला उगावे दुःख मेरे जिमि मेह ॥

پڑتا ہو اور کہتا ہو۔
 (پداوت) سوہن جس گنگن اُپرا ہیں میگھ گھٹا مینھ دیکھ بلا میں
 ملک محمد جاسی نے سہیل کے ہندی نام اگست کا بھی استعمال کیا
 ہے جس سے ان کا ہندی و عربی کے مترادف ناموں کا علم واضح ہوتا ہے۔
 (پداوت) اُسے اگست بہت جب کا جاا نیر گھٹے گھر آویں راجا
 امیٹھی کے راجا کے یہاں سے خفا ہو کر پلٹنے اور ساعت پرستش
 بتانے کا قصہ پہلے ہی آچکا ہے اس سے صرف یہی اندازہ نہیں ہوتا کہ ان
 کو نجوم سے بہرہ تھا بلکہ ان کے کمال کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۱۲۔ عام معلومات | یہ جو کچھ کہا گیا وہ ان باتوں کے متعلق تھا
 جو کتابی علوم کہے جاتے ہیں یعنی جنہیں
 انسان کتاب کے ذریعے سے حاصل کر سکتا ہے لیکن ان کے علاوہ اور
 بہت سی ایسی چیزوں سے بھی ان کو واقفیت تھی جن کا علم خارجی
 باتوں کے دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ گھوڑوں اور کہاروں
 کے مختلف قسموں کا ذکر پُرانے زمانے کے لباس کا بیان (پداوتی اور
 رتن سین کے ضمن میں) اور کچھ ان پُرانے رسم و رواج کا تذکرہ بھی
 پداوت میں آیا ہے جن کو اُس وقت لوگ جانتے ہوں گے مثلاً

سوهیل جیس گانن उपराही ।

मेघ घटा मंहि देखि बिलाही ॥

उए अगस्त हसित जब गाजा ।

नीर घटे घर आवहि राजा ॥

لے

لے

”چتر بھنگ“ یا ”بیر پوجا“ کی رسم یا یہ رواج کہ بارش کے بعد تمام کام شروع کیے جاتیں۔

پُرانے زمانے میں بڑی رانی کو ”پٹ رانی“ کہتے تھے چنانچہ ملک صاحب نے بھی یہی کہا ہے

لے اس رسم کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا کچھ لوگ چندن یا رنگ سے تصویریں بنانے کو چتر بھنگ کہتے ہیں لیکن قیاساً غلب یہ ہے کہ سونے یا چاندی کے باریک ورق کے ٹکڑے ہوتے تھے جنہیں مانگ کے پاس سے مُنہ تک ایک سیدھ میں چپکاتے تھے آج کل اس کا شایبہ رام لیلہ میں ملتا ہے جہاں لوگ تارے اور چمکدار چیزیں مُنہ پر لگاتے ہیں۔

لے بہادر اور نامور فرزند کی عزت اہل ہند کی نظریں اس درجہ تھی کہ رفتہ رفتہ عبادت اور پرستش کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ ملک محمد نے اس رسم کا ذکر مڑی آن بان سے کیا ہے جس وقت بادل کے ساتھ راجا رتن سین جھوٹ کر آتا ہے تو اس وقت پدماوتی بادل کی آرتی اُتارتی ہے اور اس کی پوجا کرتی ہے۔

رہمات، پرسی پاتیں راجا کے رانی بنی آرت بادل کھدانی
پوجے بادل کے بھج دندا ٹری کے پانوں داب کر کھندا

परसि पायं राजा के रानी । पुनि नारति बादल कंह आनी ॥

पूजे बादल के भुज दंडा । तुरी के पांव दाब कर खंडा ॥

لے پاٹ مہادیہی ہئے نہ ہارو سمجھ جیو چت جیت سنبھارو

पाट महादेह ! हिये न हारू ।

समुझि जीव, चित चेत संभारू ॥

ترجمہ { ”پاٹ مہادیہی“ دل چھوٹا نہ کرو سمجھ بوجھ کر دل کو سنبھالو۔

ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہو کہ ملک محمد کا علم صرف کتاب یا انہیں باتوں تک محدود نہ تھا جو ان کے زمانے میں تھیں بلکہ سادھوؤں فقروں اور بزرگوں کی صحبت کی بدولت وہ بہت سی ایسی باتوں سے واقف تھے جنہیں ہر شخص نہیں جان سکتا۔

اخلاق و عادات | ملک صاحب کے حالات جس تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں ان کا اندازہ کرتے ہوئے ان کے عادات و خصایل اُن کے اخلاق اور برتاؤ کے متعلق سوائے اس کے کہ خود ان کے تصنیف سے اخذ کیا جائے کوئی دوسرا ذریعہ معلومات کا بہم نہیں پہنچ سکتا۔

شاعر جاسی سنجیدہ مزاج، فقیر منش، تنہائی پسند اور خود دار تھے نہ بادشاہ کا دربار اُن کو مرعوب کر سکتا تھا نہ راجا کا جاہ و حشم۔ راجہ امیٹھی کے محل میں داخل ہونے سے جب دربانوں نے اُن کو منع کیا اس وقت کا طرز عمل ملک صاحب کی خود داری کے علاوہ اُن کے حساس ہونے کا بھی پتہ دیتا ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ باوجود انتہائے ریاضت اور خود فراموشی کے اُن میں غصہ موجود تھا اپنے قاتل کے ساتھ مہربانی کا سلوک بتاتا ہو کہ اُن کا مسلک "بادشمنان مدارا" سے بھی بلند تر تھا۔ "زبان دان محبت" ہونے کے اعتبار سے رنگ روپ، مذہب و ملت کا فرق ان کے نزدیک بالکل نہ تھا اور ان کے کمال اور اخلاق نے لوگوں کو اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے زمانے میں پہنچے ہوئے فقروں میں شمار کیے جاتے تھے لیکن ان کے دل میں انسانی محبت اور خدائی عشق نے غور کے لیے جگہ

نہ چھوڑی تھی۔ اپنے اثر سے فائدہ اٹھانا چاہتے تو کبیر داس کی طرح یہ بھی اپنا ایک نیا مذہب جاری کر دیتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کبیر کی طرح نہ تو انھوں نے یہ کہا کہ اس چادر کو دیوتا (سر، آدمی، نر) فقیر (منی) سب نے اوڑھ کر میلا کر دیا ہو لیکن میں نے ”جیوں کی تیوں رکھ دین چدریا“ اور نہ ان کی طرح جمہور کی رائے کو بے حقیقت سمجھا کبیر نے یہ بتایا کہ باطن میں سب ایک ہیں لیکن ملک محمد نے تو یہ بتایا کہ تمام چیزیں ظاہر و باطن دونوں میں ایک ہیں درحقیقت ان میں کوئی فرق نہیں۔

ملک صاحب کے اخلاق کا کچھ اندازہ اس سے بھی ہو سکے گا۔ کہ باوجود اس کے کہ یہ کبیر سے بالکل الگ راستے پر چل رہے تھے لیکن پھر بھی انھوں نے کبیر کا ذکر عزت کے ساتھ کیا ہو۔

بدیہ گوئی | بدیہ گوئی کی صرف ایک مثال ملتی ہو۔ ان کے کھیت کے قریب کسی دوسرے کا کھیت تھا۔ اس کی بیوی دوپہر کو اُس کے کھانے کے لیے گرم گرم بھنے چنے لیے جا رہی تھی جب وہ شاعر جاسی کے پاس سے گزری تو اُس کی خوشبو انھیں محسوس ہوئی برجستہ ملک صاحب نے فرمایا

”ایس جریے تو کیس نہ مہکے“

ترجمہ۔ اس طرح جلے تو کیسے نہ مہکے۔ یعنی اس طرح جب اپنے آپ کو جلاتا ہو تب اس کی خوشبو تمام عالم میں پھیلتی ہو۔

کچھ لوگ اس واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اُن کا نام سُن کر اُن کی تلاش میں جاس آیا تھا، جب یہ کھیت سے اُبل

کندھوں پر رکھے بیلوں کی جوڑی ہانکتے واپس آ رہے تھے تو وہ شخص
بھڑبھڑانے کی دکان کے قریب اُن کو ملا۔ اُنھوں نے قیافے سے
معلوم کر لیا کہ یہ میری ہی تلاش میں ہے۔ یہ معلوم کرتے ہی معاً اُن کے
دل میں یہ خیال گزرا کہ اے خدا میں نے تیری عبادت گزاری میں
اپنے کو اتنا جلا دیا ہے کہ اس کی خوشبو دُور دُور پھیل گئی ہے اور
اُنھوں نے یہ پورا شعر پڑھا۔

جیسے بھاڑ بے چھنا دہکے اِس جرے تو کیس نہ ہکے
جنہی شخص صورت شکل سے تو اُن کو جانتا نہ تھا۔ دوسرے اُن
کی صورت اور ہنیت کدائی کو دیکھ کر وہ اُن کا اور اپنے ذہنی ملک محمد
کا تطابق بھی نہ کر سکتا تھا۔ جب اُس نے یہ شعر سنا تو بیچین ہو گیا اور
نام پوچھ کر اپنے اشتیاق کا اظہار کیا۔

خصایں | اس کے علاوہ ملک صاحب کے اور خصایں کیسے تھے
اس کا کچھ اندازہ پدمات کے اُن مقاموں سے

ہو سکے گا جہاں مصنف نے ضمناً کسی چیز کے متعلق رائے زنی کی ہو مثلاً
خیرات | دھن جیون اوتا کرہیا اونچ جگت منہ جا کر دیا
ترجمہ - دولت، دل اور زندگی اُس کی ہیں جو خیرات کرے۔
دیا جو بپ تپ سب پراہیں دیا برابر جگ کچھوناہیں

ترجمہ - خیرات تمام عبادت سے بڑھ کر ہے۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں

धीन जीवन औताकर दिया ।

उंच अगत मंह जाकर दिया ॥

(پدمابھت)

کچھ نہیں۔

ایک دیا تے دس گن لہا دیا دیکھ سب جگ مکھ چھا
ترجمہ - خیرات کا بدلا دس گنا ملتا ہے۔ مخیر کا منہ دنیا تکتی ہے۔
دیا کرے آگے اُجیارا جہاں نہ دیا تہاں اندھیارا
ترجمہ - چراغ (خیرات) آگے آگے روشنی کرتا ہے۔ جہاں چراغ (خیرات) نہ ہو وہاں اندھیرا رہتا ہے۔

دیا مندر بس کرے اُجورا دیا نامیں گھر موسین چورا
ترجمہ - چراغ (خیرات) مکان میں رات کو اُجالا کرتا ہے۔ اگر چراغ (دیا) نہیں تو چور چُرا لے جائیں گے۔ یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ اگر خیرات نہ کرو گے اور جوڑ جوڑ کر رکھو گے تو چور چُرا لے جائے گا۔

صفء ۶۷ ۵۷ دیا جو جپ تپ सब उपराहीं ।

दिया वरावर जग कछु नाहीं ॥ १ ॥

۵۸ एक दिया ते दसगुन लहा ।

दिया देखि सब जग मुख चहा ॥ २ ॥

۵۹ दिया करै आगे उजियारा ।

जहां न दिया तहां अंधियारा ॥ ३ ॥

۶۰ لفظ ”دیا“ کے شاعرانہ استعمال سے فائدہ اٹھا کر دو مستقل مفہوم شعر

میں پیدا کر دیے ہیں جو لفظ ”دیا“ کو خیرات اور چراغ دونوں معنوں میں الگ الگ استعمال کرنے سے واضح ہو جاتے ہیں۔

۶۱ दिया मंदिर बसि करै अजोरा ।

दिया नाहिं घर मूसहि चोरा ॥ ४ ॥

۲۔ انکسار | یہی سینت بہوری جو جھہ نہیں کرے
کھڑک دیکھ پانی ہوئے ڈھرے
ترجمہ۔ لڑائی جھگڑا نہ کیجیے بلکہ تلوار دیکھ کر پانی کی طرح منکسر ہو جائیے۔

پانی ^۱کاه کھڑک کی دھارا لوٹ پان ہوئے سوئی جو مارا
ترجمہ۔ تلوار کی دھارا پر پانی ہی تو ہے جو لوٹ کر مارتا ہے۔

پانی سینت آگ کا کرتی جاتے بجھائے جو پانی پرتی
ترجمہ۔ پانی کے سامنے آگ کیا کر سکتی ہے۔ پانی اُسے بجھا دے گا۔

۳ مصیبت | دکھ جارے، دکھ بھونچے، دکھ کھو دے سب لاج
گاجہ چاہی ادھک دکھ۔ دکھی جانی جیہ لاج

ترجمہ۔ مصیبت جلاتی ہے۔ مصیبت بھونتی ہے۔ مصیبت سب شرم
کھو دیتی ہے۔ اور احتیاج سب سے بڑی مصیبت ہے۔

۴۔ بُرائی کے بدلے بھلائی | منہ وہ بھل جو کرے بھل سوئی
اتہر بھلا بھلے کر ہوئی

یہی سَنتی بھڑی جُکھ نہیں کرے۔ | خدگ دِکھ پانی ہو دِکھ ۱۱

پانی کاہ خدگ کی دھارا | لَوتی پانی ہو دِکھ سو دِکھ جو مارا ۱۱

پانی سَنتی لاج کا کرے۔ |

آہ بھای جو پانی پرے۔ |

دُکھ جَارے دُکھ بھُجے، دُکھ سَوے سب لاج |

گاجہ چاہی اَدھک دُکھ، دُکھی جان جِہِ لاج ۱۱

مَندھ بھل جو کرے بھل سَوے۔ |

اَرتھ بھلا بھلے کرے ہوے۔ |

ترجمہ - بُرے کے ساتھ بھلائی کرنا بھی اچھا ہی (کیونکہ) آخر میں بھلا کرنے والے ہی کا بھلا ہوتا ہے۔

شتر و جوبش دیئے چاہیں مارا دیجے لون جان بش ہارا
ترجمہ - دشمن جو زہر دے کر مارنا چاہتا ہے اُسے (یعنی دشمن کو) بجائے زہر کے نمک دیجیے۔ زہر دُور کرنے والا سمجھ کر۔

بش دینھے بشہر ہوئے کھائی لون دئے ہوئے لون بھائی
ترجمہ - دشمن کے دیے ہوئے زہر کو سانپ بن کر کھا لو۔ دشمن کو بجائے زہر کے نمک دینے سے زہر دُور ہو جائے گا۔ (اس کے بدلے میں دشمن کو) تمھارا نمک دینا اُس زہر کی دوا بن جائے گا۔

مارے کھڑک کھڑک کر لیتی مارے لون ناے سر دیتی
ترجمہ - تلوار سر الگ کر کے مارتی ہو اور نمک بغیر سر کاٹے ہوئے۔
ملک صاحب نے جس سادگی اور جس ادا کے ساتھ بُرائی کے بدلے بھلائی کرنے کی نصیحت فرمائی ہے وہ انھیں جیسے اُستاد کا کام تھا۔ اس نصیحت میں اگر بیان کی دل کشی اور انداز بیان کی سلاست کے سوا اور کچھ نہ بھی ہو تب بھی یہ حصّہ نظم آپ اپنی نظیر ہو لیکن ان اوصاف

۱۔ शत्रु जो विष देह चाहैं मारा ।

दीजय लोन जानि विष हारा ॥

۲۔ विष दीन्हे विसहर होय खाई ।

लोन दिये होय लोन बिलाई ॥

۳۔ मारे खड़ग खड़ग कर लेई ।

मारे लोन नाइ सिर देई ॥

(पदमावत)

کے ساتھ ساتھ جو بے ساختگی اس میں پائی جاتی ہو اور جن دلیلوں کے ساتھ ملک صاحب نے اس عمل نیک کی دعوت دی ہو وہ اس خیال کو بلند تر کر دیتی ہیں۔ اس حصہ نظم سے اور زیادہ لطف اندوز ہونے کے لیے اس کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

بڑے کے ساتھ بھلائی کرنا بھی اچھا ہے۔ کیونکہ آخر میں بھلا کرنے والے ہی کا فائدہ ہو اور اُسی کا بھلا ہوتا ہے۔ ہر بھلائی کا بدلہ اچھا ہوتا ہے خواہ وہ بڑے کے ساتھ کی گئی ہو یا اُس سے کسی بھلے کو فائدہ پہنچا ہے۔ اگر تمہارا دشمن تمہارے درمیان آزار ہو تو نقصان پہنچانے کے بجائے تم اُس سے بہ مہربانی پیش آؤ کہ

ع: نہ برد قہر نرم را تیغ تیز

دشمن اگر زہر دے تم اُس کے صلے میں نمک دو جو زہر دُور کرنے والا ہے۔ یہی اس زہر کے لیے تریاق کا کام دے گا یعنی تمہارا فائدہ پہنچانا تمہارے نقصان کی تلافی کر دے گا کیونکہ آئندہ کے لیے خطرے کا دروازہ تم پر بند ہو جائے گا۔ تمہارا تَلَطُّف اس کی شرمندگی کا باعث اور اُس کے باز آنے کا سبب بن جائے گا۔ تَلَطُّف میں بڑی طاقت ہو اس کا وار تلوار سے بھی بڑھ کر ہے۔ تلوار تو سر کاٹ کر سزا دیتی ہو اور تَلَطُّف بغیر سر کاٹے ہوئے۔

۵۔ جو انردی | ساہس جہاں سندھ تہنہ ہوئی

ترجمہ۔ جہاں تہمت ہو وہاں سب کام پورے ہو جاتے ہیں۔

۶۔ دولت

درب تیں گرب کرے جو چاہا

درب تیں دھرتی سرگ بسا

ترجمہ۔ دولت سے زمین، عزت اور جنت سب کچھ مل سکتی ہیں۔

درب تیں ہاتھ آؤ کیلا سو

درب تیں اچھری چھانڑنے پاسو

ترجمہ۔ دولت سے ”کیلا س“ اور علم ہاتھ آجاتے ہیں اور کوئی بات

رہ نہیں سکتی۔

درب تیں رنگن ہوئے گن دتا

درب تیں گوج ہوئے رپ دتا

ترجمہ۔ دولت سے کم سواد اہل علم ہو جاتے ہیں اور دولت بد صورتوں

کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔

درب رہے بھونیں دیے لارا

اس من درب دئے کو پار

درب ते गरब करै जो चाहा । ۷۰

درب ते धरती सरग बसाहा ॥

दرب ते हाथ आवै कैलासू । ۷۱

दرب ते अछरी छाँड न पासू ॥

दرب ते निरगुन होइ गुनबंता । ۷۲

दرب ते कुबुज होय रुपबन्ता ॥

فارسی کا یہ شعر دولت کے متعلق بہت مشہور ہے۔

ایزر تو خدائی ولیکن بخدا ستارعیوب وقاضی الحاجاتی

ان دو مصرعوں میں شاعر نے وہ کچھ کہ دیا ہے جس کے ادا کرنے کے لیے ملک صفا

کو آٹھ مصرعے بھی ناکافی ہوئے۔

درب रहे भुंह, दिये लिलारा ।

उस मन दरब देह को पारा ॥

ترجمہ۔ زمین میں دولت گرہی رہنے سے بھی چہرہ چمکتا ہے ان صفتوں کی دولت کون ہاتھ سے دیتا ہے۔

ترجمہ۔ جس کے پاس پیسے ہیں اُس کی بات ہر ایک پوچھتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں وہ پتے کی طرح مارا مارا پھرتا ہے۔

ترجمہ۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ ہاتھی کی طرح جھوم کر چلتا ہے اور بغیر پیسے کے راجا کو لوگ پاگل کہتے ہیں۔

ترجمہ۔ اگر ب تن پھولا سنٹھہ بول بدھل بھولا

ترجمہ۔ دولت کے باعث بدن استغنا سے پھول جاتا ہے اور بغیر پیسے دالے کی عقل غایب ہو جاتی ہے۔ نہ طاقت گفتار باقی رہتی ہے نہ یار آئے کار۔

ترجمہ۔ جاگی نیند نہ رہی سنٹھہ کاہ ہوئے اونگھائی

ساंठि होय जहि तेहि सब बोला । ۱

निसठ जो पुरष पात जिमि डोला ॥

सांठि हि रंक चलै भौराई । ۲

निसठ राव सब कह बौराई ॥

सांठिहि आव गरब तन फूला । ۳

निसंठहि बोल बुधिय भूला ॥

सांठि जागी नीद निशि जाई । ۴

निसठहि काह होइ औघाई ॥

ترجمہ۔ جس کے پاس پیسے ہیں اُس کی رات چین سے گزرتی ہے اور مفلس کو اونگھ بھی نہیں آتی۔

سلاطینہ دشت جوت ہوتے نینا سنسٹھ ہوتے مکھ آونہ بنیا ترجمہ۔ رُپے آنکھوں میں روشنی آتی ہے اور بغیر پیسے کے مُنہ سے آواز نہیں نکلتی۔

پدمات کے ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک محمد خیرات کو عبادت سے بڑھ کر سمجھتے تھے اور منکسر مزاجی اور بدی کے بدے بنی کرنے کو کامیابی کا راز، مال و دولت کی جو تعریف ملک محمد نے کی ہے وہ کسی بادشاہ یا امیر کی خوشامد کی غرض سے نہ تھی بلکہ خود لفظ پکار تے ہیں کہ وہ دولت کی وہی تعریف کر رہے ہیں جس کی وہ مستحق ہے۔ چونکہ وہ خود ایک معمولی حیثیت کے خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور بچپن ہی میں والدین کے مرجانے سے رنج اٹھائے ہوئے تھے اس لیے جو انھوں نے لکھا وہ تجربہ معلوم ہوتا ہے اور صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس کے ماننے میں کوئی پس و پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ”یہ آپ بیتی“ ہے اور اگر آپ بیتی نہ سمجھا جائے تب بھی دولت و ثروت کے جو کرشمے ہماری نظروں کے سامنے آج بھی آتے ہیں وہ ملک محمد کے کلام کی تائید کرتے ہیں اس موقع پر اس بات کا بتا دینا ضروری ہوتا ہے کہ خود ملک محمد کو دولت مند بننے کی خواہش نہ تھی بلکہ انھوں نے بحیثیت ایک فلسفی کے دنیا کی حالت بیان کی ہے۔

साँठहि विस्टि जोति होइ नैना ।

निखँठ होय मुख आव न बैना ॥

وفات | خزینۃ الاصفیا اور رسالہ شیخ عبدالقادر جاسی دونوں میں
ملک صاحب کا سنہ وفات ۱۰۴۹ھ درج ہے جو شاہجہاں
کا عہد تھا۔

خزینۃ الاصفیا میں صاحب معراج الولایت کے حوالے سے یہ بھی
لے ملک صاحب کی وفات کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی سال واقع ہوئی جس
سال وہ دربار میں بلانے گئے تھے۔ لیکن اس امر کے متحقق نہ ہونے کے سبب سے کہ وہ
لب اور کس کے دربار میں بلاتے گئے تھے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ ملک صاحب نے کب
وفات پائی۔

واجد علی شاہ (فرمانروائے اودھ) کے عہد میں ایک بزرگ گزرے ہیں قاضی
سید عادل حسین ابن قاضی سید نصیر الدین جاسی ان کی یادداشت میں یہ لکھا ہوا پایا
گیا ہے کہ ۱۰۴۹ھ شہادت "ملک محمد" ممکن ہے کہ قاضی صاحب کی لکھی ہوئی تاریخ
صحیح ہو لیکن اگر اس مسئلے میں قیاس کو ذرا بھی گنجائش ہو تو صاحب معراج الولایت کا بیان اقبال
قدامت زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور مولوی غلام سرور مرحوم (لاہوری) اور مولوی عبدالقادر
مرحوم (جاسی) کے اس معاملے میں متحد القول ہونے کی بنا پر ملک صاحب کا سنہ وفات ۱۰۴۹ھ
ہی متعین ہوتا ہے یہ خوف کہ ایسا کرنے سے ملک صاحب کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے بے معنی بھی ہے
اور مضحک بھی۔

لے چو از دنیا محمد نزد حق رفت بہ سال رحلت آن شاہ عالی
کیے فضل و کمال اولیا خواں دگر فرما محمد شیخ دالی
تاریخ از مصنف خزینۃ الاصفیا یعنی مولوی غلام سرور صاحب لاہوری
۱۰۴۹ھ بعد شاہجہاں در سال یک ہزار پچہل ونہ وفات یافت (رسالہ شیخ عبدالقادر)
۱۰۴۹ھ صاحب معراج الولایت فرمود کہ دے تا آخر خلافت اکبر شاہ بقید حیات بود
اما حال وفاتش در کتاب خود نقرمودہ - (خزینۃ الاصفیا)

لکھا ہو کہ ملک صاحب اکبر بادشاہ کی خلافت کے آخر تک زندہ تھے۔ لیکن انھوں نے وفات کا کوئی سنہ نہیں دیا۔

ان بیانات کی بنا پر ملک صاحب نے گویا ۱۴۹ برس کے سن میں

وفات پائی۔

ایک تاریک شب کو جبکہ ملک صاحب ذکر اسدی میں مشغول تھے۔ امیٹھی کے ایک بھلیے نے ملک کی آواز کو شیر کی آواز سمجھ کر آواز پر گولی لگائی اور وہ گولی ملک صاحب کی پیشانی پر لگی اور یہ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ اس حادثے کی تفصیل یہ بتائی جاتی ہو کہ جب امیٹھی کا راجا ملک صاحب سے ملنے اُن کی خانقاہ میں آتا تھا تو اس کے ساتھ یہ بھلیا (تفنگچی) بھی ہوتا تھا اور اس کی خاطر ملک صاحب بہت کرتے تھے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ کو سب سے زیادہ یہی بھلیا عزیز ہو شاعر جانشی نے جواب دیا کہ ”یہ میرا قاتل ہو“ یہ سن کر عجیب خاموشی خانقاہ پر چھا گئی۔ بھلیے نے کہا کہ قبل اس کے کہ میں اپنے دوزخ میں جانے کا سامان کروں مجھ کو قتل کر دیا جائے۔ راجا نے بھی اس کو قتل کرنے کی اجازت چاہی مگر ملک صاحب نے دونوں کو منع کیا اس کو جان دینے سے اور راجا کو جان لینے سے۔ لیکن راجا نے احتیاطاً اس کی بندوق ضبط کر لی اور سلطہ خانے کے داروغہ کو حکم دیا کہ خبردار اس کو کبھی بندوق نہ دی جائے۔ راجا کے حکم پر فوراً عمل درآمد شروع ہو گیا بندوق داخل کرا لی گئی مگر اس کے بعد

لے ذکر اسدی۔ ذکر کے لفظی معنی ہیں یاد کرنا یہ ایک طریقہ ریاضت و عبادت

کا ہو۔ مختلف گروہوں کے فیروں، درویشوں کا جس میں شیر کی سی آواز پیدا ہوتی ہو۔ اسی کو ذکر جہر یا ادہ بھی کہتے ہیں۔

بھی اُس کو محل کی محفلوں اور صحبتوں میں پہلا ہی سادہ رُخ حاصل رہا۔ ایک روز رات کو محل سے گھر جانے میں دیر ہو گئی۔ رات بھی اندھیری تھی۔ اُس نے داروغہ سے کہا کہ رات بھر کے لیے بندوق دے دو راستے میں گھنا جنگل پڑتا ہے۔ ممکن ہے کوئی جانور مل جائے۔ داروغہ نے اس میں مضائقہ نہ سمجھا اور بندوق پہلے کے حوالے کر دی۔ جب بہلیا جنگل کے قریب پہنچا تو اُس نے شیر کے غرانے کی آواز سنی۔ فوراً آواز پر نشانہ کیا۔ جو ملک کی پیشانی پر بیٹھا۔ آواز بند ہو گئی۔ بہلیا سمجھا کہ گولی لگ گئی، رات بھی زیادہ جا چکی تھی۔ وہ سیدھا اپنے گھر چلا گیا اور ملک صاحب کو ایسا زخم لگا کہ فوراً انتقال فرما گئے۔

اُدھر محل میں راجا نے جو محو راحت تھا خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ تم یہاں آرام سے سو رہے ہو وہاں ملک صاحب کو پہلے نے مار ڈالا راجا فوراً بیدار ہوا اور سرو پا برہنہ جنگل کی طرف دوڑا۔ خانقاہ کے قریب پہنچا تو ملک صاحب میں ذرا دم نہ پایا، ایک کہرام مچ گیا۔ محل میں سوگ شروع ہو گیا۔ تجھیز و تکفین کا سامان ہونے لگا۔

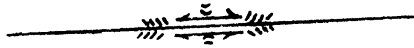
رام نگر میں متصل گڑھ اسی محل سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر راجا نے اُن کا مزار بنوایا اور ایک قرآن خواں کو مقرر کر دیا کہ تلاوت کیا کرے۔ اب البتہ مزار پر نہ کوئی قرآن پڑھتا ہے اور نہ ریاست ہی کچھ توجہ کرتی ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ قرآن خواں کی علیحدگی ۱۹۱۳ء سے عمل میں آئی ہے اور اُسی وقت سے ریاست کی حالت میں تبدیلی شروع ہو چلی تھی اور اب ریاست سرکاری نگرانی میں ہے۔

ملک محمد جاسی کا مرتبہ ہندی ادب میں | قرون وسطیٰ کے

ملک محمد جاسی کا درجہ بہت بلند ہے۔ ایک زمانے میں تو یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رزمیہ مثنوی لکھی ہے اس کے متعلق اب اختلاف آرا ہے لیکن پوربی ہندی (اودھی) کے نامور اہل قلم ہیں ان کی اولیت مسلم ہے اور ان کا شاہ کار پداوت بذات خود ایک مطالعہ ہے ممکن ہے ہندی قصہ لکھنے والوں میں ملک صاحب کے پیشرو چند ممتاز ادیب ہوئے ہوں لیکن اتنا تو بغیر کسی شک کے کہا جاسکتا ہے کہ وہ سب سے پہلے بڑے مصنف ہیں اور جو مثال انہوں نے پیش کی ہے اس کی تقلید ہندو اور مسلمان دونوں کرتے ہیں۔ اُن کا بیان اتنا ہی فطری ہے جتنی اُن کی زبان ٹکسالی اور تصنع سے پاک ہے۔ افسوس اس خداترس فقیر مرزاں مرچ بزرگ کو دنیا نے بھلا دیا۔ جس شخص میں رواداری، اخلاق و سنجیدگی سبھی کچھ باتیں موجود تھیں اُس کی قدر اُس کے اخلاف نے نہ کی۔ لیکن یہ کوئی جلع تعجب نہیں۔ دنیا نے اکثر اور ہم ہندوستانیوں نے عموماً اپنے جمود کا یونہی ثبوت دیا ہے جس جماعت نے خود اپنے زبان کے شہنشاہ کی قدر ایک معمولی ادیب کے برابر بھی نہ کی ہو، جس کے سب سے بڑے ادیب کا کلام طباعت اور کتابت کے اعتبار سے تیسرے درجے کے شاعر کے مجموعہ کلام سے بھی زیادہ کم حیثیت ہو۔ اُنہیں اور تیر کے مزاروں کی بوسیدہ فصیلیں اور اور اُن کی ناگفتہ بہ حالت جس فرقے کی بے حسی کا اعلان۔ یہ بانگ دہل کر رہی ہو اُن کے افراد سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ملک محمد جاسی کے

کلام کو سراہیں گے یا اُس کا غایر مطالعہ کریں گے جن کا ناتا اُردو سے
پھر بھی بہت دُور کا ہے۔

البتہ سر جارج گری یرسن ایسے ہندی ادیب اور نثر کی
نظروں میں شاعر جاسی کا درجہ نامور شاعران ہند میں بہت بلند ہے اور
اُس وقت تک بلند رہے گا جب تک ہندی ادب کا ایک بھی دلدادہ
باقی ہے۔



۲- تصانیف

ملک صاحب کی تصانیف کے متعلق وہ روایت تو نقل کی ہی جا چکی کہ اُن کے سات لڑکوں کے بجائے ان کی چودہ تصانیف یادگار رہیں گی۔ لیکن لوگوں میں تعداد تصنیف کے بابت اختلاف ہے۔ کچھ بتاتے ہیں کہ سات تھیں، کچھ نو بتاتے ہیں اور چودہ نام بھی گنوائے جاتے ہیں یعنی اکھراوٹ، پدماوٹ، سکھراوٹ، چنپاوت، اتراوٹ، مٹکاوٹ، چتراوٹ، کہر وانا نامہ، مورائی نامہ، کھرانا نامہ، پوستی نامہ، مہرانا نامہ، ہولی نامہ، آخری کلام۔ لیکن ان میں سے صرف تین ملتی ہیں۔ اکھراوٹ، پدماوٹ اور آخری کلام۔ باقی کا کہیں پتہ نہیں شک ہوتا ہو کہ تھیں بھی یا نہیں۔ مجھے تو قرین سے ایسا گمان ہوتا ہو کہ دراصل ملک صاحب کی تصانیف چودہ سے کہیں کم تھیں۔ یہ محض ان کے ارادت مندوں کا زور تخیل ہو جس نے تصانیف کی تعداد کو اتنا بڑھا دیا ہو اور اگر ایسا نہیں ہو تو پھر قافیہ پیمائی سے کام لیا گیا ہو گا کیونکہ اُن ناموں کے علاوہ جن سے کان آشنا ہیں جو نام بتائے جاتے ہیں وہ یا تو پدماوٹ کے قافیہ میں ہیں یا ”نامہ“ کی ترکیب کے ساتھ۔

ملک صاحب کی جن چودہ تصانیف کے نام لیے گئے ہیں اس میں سے دو نام اتراوٹ اور مٹکاوٹ تو حکیم احمد اشرف صاحب جاسی کے بتائے ہوئے ہیں جو اور کہیں نہیں ملتے بقیہ بارہ ناموں میں سے آٹھ رسالہ عبدالقادر جاسی و سید علی نقی صاحب جاسی کی تاریخ دونوں میں مشترک ہیں باقی رسالوں میں سے ”چتراوٹ“ اور ”کہرانا نامہ“ کے نام صرف عبدالقادر صاحب نے دیے ہیں اور سکھراوٹ کا تذکرہ محض علی نقی صاحب نے کیا ہو اور ایک نام خزینۃ الاصفیاء سے معلوم ہوا ہو یعنی ”ہولی نامہ“

تمام تصانیف بھاکا زبان میں بتائی جاتی ہیں اور جتنی اب تک دستیاب ہو سکی ہیں ان کا موضوع تصوف ہو یا مذہبی عقیدت ہندی اور جو اصل نسخے ابتداءً ملے وہ سب فارسی رسم الخط میں ہیں۔ البتہ اکھراوٹ کی چوپائیوں کو بلا لحاظ ”حروف تہجی“ ”ہندی لکرا“ سے شروع کرنا اس گمان کو قوت پہنچاتا ہو کہ ملک صاحب نے اکھراوٹ کو ہندی رسم الخط میں لکھا ہوگا۔

پدماوت | پدماوت ملک صاحب کا شاہ کار ہے قبل اس کے کہ اس نظم کے متعلق تنقیدی حیثیت سے گفتگو کی جائے اور نظم کی زبان، تسلسل اور روانی پر تبصرہ کرتے ہوئے اشعار کی برجستگی ہندی مذاق کی تشبیہوں، استعاروں کے استعمال محاکات کی کثرت اور حسن ادا کی دل نشینی کے متعلق کچھ عرض کیا جائے اس قصے کو سنا دینا مناسب معلوم ہوتا ہو کیونکہ اسی قصے پر جو پدمنی اور رتن سین کی محبت اور علاؤ الدین کی چتور پر فوج کشی کا ایک دلچسپ افسانہ ہے نظم کی عالیشان عمارت بنائی گئی ہے۔

اس کے بعد پدماوت پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کرنے سے نظم اور نثر، کہانی اور تاریخ، شاعر اور مودّخ کا فرق بھی ظاہر ہو جائے گا۔ تصوف اور معرفت کی جو جھلک نظم میں پائی جاتی ہو اس پر بھی کافی روشنی پڑے گی۔ اس وقت تو قصہ سُنیے۔

پدماوت کا قصہ | قدرت نے سنبھل دیپ کو انواع و اقسام کی نعمتوں اور عطیوں سے مالا مال کیا تھا موسم کی خوشگوار سی، مناظر کی خوبصورتی اور زمین کی زرخیزی سے

سنبھل کا چپّہ چپّہ دل کش اور دل فریب تھا اور گندھرو سین جیسے مدبّر منتظم منصف مزاج اور نیک دل بادشاہ کی حکومت کی بدولت رعایا خوش حال تھی، ملک میں امن و امان تھا۔ نہ باہر کے حملوں کا خوف، نہ اندرونی شورشوں کا خدشہ!!۔

ظاہر ہی ایسی روشن زمین میں ایسے شاداب مرغزاروں اور ایسے خوش منظر مقامات پر کیا ہو جو بمصداق ”ہر کہ در کان ہک رفت نکشد“ دل فریب نہ ہو جائے۔ لیکن جو شہرت راجا گندھرو سین کی بیٹی شہزادی پدماوتی کو اپنے حسن و جمال کی بنا پر حاصل تھی اُسے راجا کے پای تخت یعنی سنبھل کی آراستگی اور دل کشی سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کے ذاتی محاسن پر مبنی تھی جس میں سیرت اور صورت دونوں شامل ہیں۔ لیکن عجیب بات تھی کہ عیش و آرام کی گود میں پل کر جب پدماوتی سیانی ہوئی تو بجائے اس کے کہ شاد و خوش دل نظر آتی، متفکر رہنے لگی۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا اُس کی دل گرفتگی بڑھتی جاتی تھی۔ شاید پدماوتی کسی کو اپنا شریکِ زندگی بنانا چاہتی تھی (تاکہ شباب کے بہار کی اُس کے ساتھ سیر کرے اور اُس سے دل سیر ہونے کے بعد اُس کے ساتھ بیٹھ کر گوری ہوئی پُر لطف گھڑیوں کی یاد سے دل بہلایا کرے) ایسا شریکِ زندگی اُسے اب تک نہ ملا تھا۔ یایوں کہیے کہ راجہ گندھرو سین کی نظروں نے کسی کو منتخب نہ کیا تھا۔ ایک روز پدماوتی کو معمول سے زیادہ ملول دیکھ کر ہیرامن تو تے نے (جسے پدماوتی بہت عزیز رکھتی تھی) اس کی افسردگی کا سبب دریافت کیا۔ شہزادی سے اُن جذبات کا حال سُن کر جو اُسے انگاروں

کے بستر پر سلاتے تھے۔ تو تے نے پدماوتی کے لایق شوہر تلاش کرنے کی اجازت چاہی۔ سو اتفاق سے ان واقعات کی اطلاع راجا تک پہنچی اور اُس نے تو تے کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا۔ لیکن بعد میں پدماوتی کی منت سماجت اور محل کی عورتوں کی سفارش سے اس کی جان بخشی کر دی گئی۔

اگرچہ اس مرتبہ ہیرامن کی جان بچ گئی لیکن اس واقعے کے بعد سے اُسے ہر گھڑی جان کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ پدماوتی سے اجازت بھی مانگی مگر اُس کی التجا قبول نہ ہوئی تو مجبوراً خاموش ہو گیا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دن جب پدماوتی اپنی سہیلیوں سمیت غسل کرنے گئی ہوئی تھی ہیرامن نے اپنے کو اکیلا پا کر جنگل کی راہ لی جنگل کے پرندوں نے ہیرامن کا نہایت پُر جوش خیر مقدم کیا۔ اُس کی بڑی مارات کی اور اس طرح اس کے کئی دن بڑی راحت سے گزرے۔

دس دن بعد ایک ہیلیا (بھٹی مار) ہری پتوں کی ٹٹی لیے اس جنگل میں پہنچا جہاں ہیرامن تھا اور پرند تو اُس چلتے ہوئے پیڑ کو دیکھ کر لڑ گئے لیکن ہیرامن بے خبری میں وہیں بیٹھا رہا۔ آخر کار ہیلیے نے اُسے پھوٹا اور بازار میں بیچنے کی غرض سے لے گیا۔ چتور کے ایک آدمی نے جو کچھ تجارتی فوائد کے خیال سے سنہل کے بازار میں آیا تھا اس تو تے کو اس کی خصوصیتوں اور خاص کر معلومت کی بنا پر منفعت کا اچھا ذریعہ سمجھا اور اُسے خرید کر چتور لے گیا وہاں اس تو تے کی شہرت چتور کے راجا رتن سین تک پہنچی اور اُس نے

ایک لاکھ پڑ کے بدلے اُسے خرید لیا۔

ایک دن جبکہ رتن سین شکار کو گیا تھا۔ اُس کی رانی ہیرا من کے پاس آئی اور پوچھنے لگی کہ آیا دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی خوبصورت ہے۔ اُس پر توتے نے پدماوٹی کے حسن و جمال کا نہایت شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا اور طننر آمینر لہجے میں کہا کہ اُن میں اور تم میں روز روشن اور شب و بکور کا فرق ہے۔ توتے کی گفتگو سن کر رانی ناگہمی کا چہرہ فٹ ہو گیا وہ ڈری کہ اگر یہ توتا رہا تو کسی دن راجا کے سامنے بھی پدماوٹی کا یو نہی ذکر کر کے اُسے پدماوٹی کے عشق میں مبتلا کر دے گا۔ پھر کہیں راجا اُس کے عشق میں جوگی بن کر نکل نہ جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رانی کے دل میں توتے کی جو محبت تھی وہ عداوت سے بدل گئی اور اُس نے ہیرا من کو مار ڈالنے کے لیے ایک خادمہ کے سپرد کیا۔ خادمہ نے (کچھ خیال کر کے) اُسے مارا نہیں بلکہ چھپا رکھا۔

شکار سے پلٹنے پر جب بادشاہ نے توتے کو نہ پایا تو اُسے اتنا افسوس ہوا کہ اُس نے کھانا پینا تک چھوڑ دیا جب بادشاہ کے رنج میں بجائے کمی کے اضافہ ہی ہوتا گیا تو کسی نہ کسی بہانے سے توتا اُس کے سامنے لایا گیا اور اس نے تمام واقعہ کہ سنایا۔

یہ واقعہ سن کر رتن سین کو پدماوٹی کا حال معلوم کرنے کی بڑی خواہش ہوئی۔ جس عورت کے ذکر نے ایک عورت کے ہاتھوں کے توتے اڑا دیے تھے وہ ذکر ایسا جادو نہ تھا جو رتن سین پر اثر نہ کرتا توتے کے منہ سے پدماوٹی کی رعنائیوں کا تذکرہ سن کر رتن سین

بالکل از خود رفتہ ہو گیا اور مجنوں کی طرح پدماوتی کی تلاش میں گھر سے رخصت ہوا۔ ہیرامن بھی راہ بتانے کے لیے ساتھ ہولیا۔

راجہ رتن سین کے ہمراہ سولہ ہزار کنور بھی جوگی بن بیٹھے اور یہ قافلہ کا قافلہ ملک کالنگ پہنچا۔ وہاں کے راجا گجپتی سے جہاز لے کر یہ لوگ سنہل دیپ کی طرف روانہ ہوئے اور سات سمندر پار کر کے سنہل دیپ

لے سنہل کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ اگر سنہل نام کو ٹھیک مان لیں تو وہ راجہ تانے یا گجرات کا کوئی مقام ہو گا نہ کہ سنہل دیپ کیونکہ سنہل دیپ میں نہ راجپوتوں اور وہ بھی جوہان راجپوتوں کی بستی کا کوئی پتہ چلتا ہے اور نہ قراین بتاتے ہیں کہ ایسے دور دراز جزائر میں اہل ہند خصوصاً راجپوت ازدواجی تعلقات (جس کا ذکر آگے آئے گا) قائم کریں گے۔ وہ بھی تین سو برس پہلے جبکہ اہل ہند باہر کے ممالک سے قطع تعلق کر چکے تھے اس کے علاوہ سنہل اور تامل ایسے مقاموں میں پدماوتی ایسی حسین عورت کا ہونا گوارہ نہیں تھا۔ سادھوؤں کی من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کا لحاظ کرنے ہوئے پدمنی کو سنہل دیپ کا بتانا درست نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ گورکھ پنتھوں کی وہ روایتیں جس میں حسین و جمیل عورتوں (پدمنوں) کا سادھوؤں کو بہکانے کا ذکر ہے ملک صاحب کا ماخذ ہوں۔

سنہل کی ”پدمنوں“ کے دل بھانے کا یہ قصہ بہت مشہور ہے۔

گورکھ ناتھ (سمت ۱۶) کے گرو مچھندر ناتھ جب سنہل میں اپنی خداسی کا امتحان دینے گئے تو پدمنوں کے جال میں پھنس گئے اور انھوں نے انھیں ایک کنوئیں میں قید کر دیا اپنے گرو کی تلاش میں گورکھ ناتھ بھی سنہل گئے اور اسی کنوئیں کے قریب سے گزرے جہاں ان کے گرد نظر بند تھے۔ وہ اپنے گرو کی آواز پہچان کر ٹھہر گئے

اور بولے:-

”جاگ مچھندر گورکھ آوا“

پہنچے وہاں جہاز سے اتر کر رتن سین مع اپنے ہمراہیوں کے مندر میں پوجا کرنے لگا اور توتا پدماوتی سے ملنے کی غرض سے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ جاتے وقت وہ کہ گیا کہ پدماوتی بسنت پنچمی کے دن اسی ہادیو کے مندر میں پوجا کرنے آئے گی تو اس کے درشن ہوں گے اور مراد بر آئے گی۔

ہیرامن کو عرصے کے بعد دیکھ کر پدماوتی بہت روتی۔ جب خاموش ہوئی تو توتے نے اپنے نکل بھاگنے، پکڑے جانے اور پکینے کا پورا پورا حال بیان کیا اور اسی سلسلے میں راجا رتن سین کے حسن کی سبھی تعریف و توصیف کی اور یہ بھی کہا کہ ”وہ ہر پنچ سے تمہارے قابل ہو اور تمہاری محبت میں جوگی بن کر یہاں تک آپہنچا ہو۔ توتے کے منہ سے راجا کا ذکر سن کر پدماوتی نے عہد کیا کہ سوائے رتن سین کے اور کسی دوسرے کی ہو کر نہ رہے گی۔ ساتھ ہی ساتھ بسنت پنچمی کے روز راجا سے ملنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

پدماوتی سے باتیں کر کے توتا رتن سین کے پاس پلٹ آیا اور راجا کے شہزادی کے موہ لینے کی خوش خبری سنائی۔

بسنت پنچمی کے دن پدماوتی سہیلیوں سمیت مندر میں پہنچی اور اُس طرف بھی گئی جدھر رتن سین اور اُس کے ہمراہی فروکش تھے لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی رتن سین سر بسجود ہو کر غش ہو گیا۔ پدماوتی بے ہوش ہو گئی کے پاس آئی اور اُسے ہوش میں لانے کے لیے صندل چھڑکا لیکن جب وہ کسی طرح ہوش میں نہ آیا تو چند دن سے اُس کے سینے پر یہ لکھ کر چلی گئی۔

"جوگی تو نے بھیک حاصل کرنے کے لائق جوگ نہیں سیکھا۔ جب پھل ملنے کا وقت آیا تب سو گیا۔" راجا کو جب ہوش آیا تو اُسے بڑی پیشامانی ہوئی اور اُس نے خود کشی کا ارادہ کیا۔ رتن سین کے اس ارادے سے دیوتا بڑے متوحش ہوئے۔ انھیں خوف تھا کہ راجا کے ارادوں میں کامیابی دنیا کی تباہی کا سبب ہوگی۔ گویا آتش محبت کے اثر سے وہ بخوبی واقف تھے۔

غرض مخلوق خدا کی جاں بڑی کے خیال سے تمام دیوتا مہادیو جی کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن سے مدد کے خواستگار ہوئے۔ مہادیو جی کوڑھی کے بھیس میں ہل پر سوار ہو کر مع پارہتی دیول کے راجا کے پاس آئے اور خود کشی کا سبب دریافت کیا۔

پدماوتی کے ساتھ راجا کے عشق کا حال معلوم کر کے پارہتی دیوی کو یہ خیال ہوا کہ رتن سین کی محبت کا امتحان لیا جائے اس ارادے سے وہ نہایت حسین و جمیل عورت کے لباس میں راجا کے قریب جا کر کہنے لگیں "مجھے اندر نے بھیجا ہے۔ پدماوتی کو چھوڑ میں حاضر ہوں۔"

رتن سین نے جواب دیا "مجھے پدماوتی کے سوا کسی سے مطلب نہیں" یہ جواب پا کر پارہتی دیوی کو یقین ہو گیا کہ راجا کا عشق سچا ہے۔ دوران گفتگو میں رتن سین کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ کوڑھی کے جسم پر نہ تو مکھیاں بیٹھتی ہیں اور نہ اس کی پلکیں جھپکتی ہیں۔ اس نے ط کیا کہ یہ کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہو گا لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے مہادیو جی کو پہچان لیا اور قدموں پر گر پڑا۔ مہادیو نے اُسے حفظ جاں کا تعویذ دیا اور سنہل گرٹھ میں داخل ہونے کا راستہ بتایا۔

القصہ مہادیوجی سے سنہل کے داخلے کا راستہ معلوم کر کے رتن سین مع ہمراہیوں کے سنہل گڑھ پر چڑھنے لگا۔

پدماوتی کے شوق میں رتن سین نے دونوں کی راہ گھنٹوں میں طر کی اور راتوں رات قلعے کے پھاٹک تک پہنچ گیا لیکن ابھی اس نے دروازے کو کھولا ہی تھا کہ صبح ہو گئی اور شاہی فوج نے اسے حراست میں لے لیا۔ گرفتار ہونے سے قبل جب رتن سین کے ہمراہی راجا کی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تو اُس نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر باز رکھا کہ ”راہ عشق میں پند و پیکار بیکار ہے۔“

قیدیوں کا یہ قافلہ جب بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے سب کے لیے سولی کا حکم دیا۔ اس حکم کی خبر پا کر پدماوتی کے اضطراب میں اور بھی اضافہ ہوا۔ لیکن جب توڑنے کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مہادیوجی نے انہیں ایک ایسی چیز مرحمت فرمائی ہے جس سے اُن کی جان کو کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچ سکتا تو شہزادی کو کچھ سکون ہوا۔

بادشاہ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیاریاں شروع ہو گئیں، ایک طرف تو لوگ تیاریوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف رتن سین کی زبان پر پدماوتی کا نام تھا اور چہرے پر آثارِ فرقت۔ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور تعمیل میں صرف چند لمحوں کی کسر رہ گئی تو مہادیوجی بھاٹ کی شکل میں گندھروسین کے سامنے آئے اور رتن سین کا تعارف اس طرح کیا کہ ”یہ شخص جو گی نہیں راجپوت ہے۔ یہ عالی نسب اور عالی منزلت اور ہر لحاظ سے تمھاری لڑکی کے مناسب شوہر ہے۔“

بھانٹ کے مُنہ سے یہ آخری فقرہ سُن کر بادشاہ اور بھی برہم ہوا اور نہایت نُرش لہجے میں سوئی کا حکم دیا۔ مہا دیوجی کے ساتھ بادشاہ کا یہ طرز عمل رتن سین کے ہمراہیوں کو پسند نہ آیا اور وہ اس قدر برا نگینہ ہوئے کہ باوجود رتن سین کی ممانعت کے لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ اب کیا تھا فریقین میں جنگ چھڑ گئی اور مہا دیوجی مع دوسرے دیوتاؤں کے رتن سین کی گمک کے لیے اکھڑے ہوئے جنگ کے دوران میں گندھرو سین (سنہل کے راجا) کو مہادیو کے گھنٹوں کی آواز سُن کر خیال ہوا کہ دیوتا اس کے مخالف کے معین معلوم ہوتے ہیں۔ جب یہ خیال یقین کی حد کو پہنچ گیا تو سنہل کے راجا نے صلح کا پیغام بھیجا اور مہادیوجی کو پہچان کر شرمندہ ہوا اور کہا کہ ”لڑ کی آپ کی، ہر جسے چاہے دیکھیے“ اب تو نقشہ ہی بدل گیا، ہیرامن نے شروع سے آخر تک ساری داستان کہ سنائی اور اس طرح پدماوتی کی شادی بڑی دھوم دھام سے رتن سین کے ساتھ کر دی گئی۔ رتن سین کے ہمراہی بھی وہیں بیاہ دیے گئے اور کچھ دنوں کے لیے سنہل ان سب کا گھر بن گیا۔

ادھر تو سنہل میں عیش و سرور کی محفلیں گرم تھیں اور ہر گوشہ ”دامان باغبان و کف گل فروش“ بنا ہوا تھا ادھر چیتور میں رتن سین کی فرقت زدہ رانی ناگمتی اپنے شوہر کی مفارقت میں برہا کی کوک سے ایک ہنگامہ حشر برپا کیے ہوئے تھی۔ اُس کی دل گداز آہوں سے دنیا مغموم تھی اور کیا عجب کہ آسمان تک اُن کا اثر ہوتا ہو۔ ناگمتی کے ہلکے ہلکے رونے سے جانور تک روتے تھے اس کے رنج و غم کی یہ نوبت پہنچی کہ ایک پرندے سے نہ رہا گیا اور اُس

نے ناگمتی سے رونے کا سبب دریافت کیا۔ سبب معلوم کر کے اُس پرند نے وعدہ کیا کہ وہ سنہل دیب جا کر چتور اور ناگمتی کی تباہ حالت کا ذکر رتن سین سے کرے گا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ رتن سین کو واپس لانے کی ہر امکانی کوشش کرے گا۔ ناگمتی سے وعدہ کر کے وہ سنہل کی طرف اُڑا اور کچھ مدت میں وہاں پہنچ گیا حسن اتفاق سے جنگل کے جس پیڑ پر وہ جا کر بیٹھا تھا اس کے نیچے رتن سین شکار کھیلتا ہوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ پرند نے رتن سین کو پہچان کر چتور کی تمام حالت جوں کی توں بیان کر دی۔ واقعات کو سن کر اُس کا دل سنہل سے اُچاٹ ہو گیا اور وہاں کا عیش و آرام بے حقیقت نظر آنے لگا۔

بے انتہا مال و دولت ساتھ لے کر رتن سین سنہل سے رخصت ہوا۔ جہاز ابھی آدھے سمندر میں بھی نہ پہنچے تھے کہ سخت طوفان آیا اور رتن سین کا پورا قافلہ لنکا کی طرف بہ نکلا۔ لنکا پہنچ کر ایک راکشش ملا جو راستہ بتانے کے بہانے سے رتن سین کو ایسے مقام پر لے گیا کہ جہاز چکر کھانے لگے اور نکلنا مشکل ہو گیا۔ تمام آدمی گھوڑے اور ہاتھی جو ساتھ تھے سب ڈوبنے لگے۔ اس تباہی سے وہ مردم آزار تو مارے خوشی کے پھولانہ سماتا تھا۔ بارے ایک پرند کی امداد سے اس گرداب بلا سے نجات ملی۔ پھر بھی چونکہ ہچکولوں کی وجہ سے جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا ایک تختے پر ایک طرف رانی بہنگی اور دوسری طرف دوسرے تختے پر راجا، پدماوتی بہتے بہتے وہاں پہنچ گئی جہاں سمندر کی لڑکی لکشمی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ لکشمی بیہوش پداوتی

کو لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ جہاں ایک عرصے کے بعد اُسے ہوش آیا تو رتن سین کی جدائی سے بہت مضطرب ہوتی اور اپنے کونٹے ماحول اور راجپوتوں میں دیکھ کر اور بھی زاید پریشان ہوتی۔ لکشمی نے پدماوٹی کے اضطراب کو دیکھ کر اپنے والد سمندر سے رتن سین کے تلاش کرنے کی درخواست کی اور پدماوٹی کو راجا کے مل جانے کا یقین دلا کر تسلی بخشی۔

راجا رتن سین بہتے بہتے ایسے مقام پر پہنچا جہاں مونگے کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اب راجا کے لیے پدماوٹی کی جدائی ناقابل برداشت تھی یہاں تک کہ اُس نے جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی ٹھان لی۔ وہ اپنے ارادے کو پورا کرنے والا تھا کہ سمندر کا دیوتا اُس کے سامنے آکھڑا ہوا اور کہنے لگا ”جان کیوں دیتے ہو؟ میری لاٹھی پکڑ کر آنکھیں بند کر لو میں تمہیں پدماوٹی کے پاس پہنچائے دیتا ہوں“ جب رتن سین اس جزیرے میں پہنچا جو سمندر کا جائے قیام تھا تو لکشمی کو راجا کے عشق کی امتحان کی سوچھی اور وہ پدماوٹی کی صورت میں اس کے راستے میں جا بیٹھی۔ رتن سین اُس کو پدماوٹی سمجھ کر اس کی طرف لپکا لیکن جب نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور ہو تو مٹھ پھیر لیا۔ غرض لکشمی رتن سین کو اپنے گھر لائی اور کئی دن تک مہمانی کی۔ رتن سین کے قافلے کے باقی لوگ بھی جو طوفان میں بہ گئے تھے لاکھڑے کیے اور جو مر گئے تھے وہ امرت سے دوبارہ زندہ ہو گئے۔

چند دنوں لکشمی کی صحبت میں گزار کر پدماوٹی نے رخصت چاہی

اور اس طرح رتن سین کا قافلہ پھر ہنسی خوشی چٹور کی طرف روانہ ہوا۔ چلتے وقت لکشمی نے پانچ بیش قیمت چیزیں (امرت، ہنس، راج برکش، شار دودل اور پارس پتھر) بطور ہدیہ کے دیں جنہیں لے کر پدماوتی چٹور پہنچ گئی۔ پھر تو ناگمتی اور پدماوتی دونوں سکھ چین سے بسر کرنے لگیں۔ ناگمتی سے ناگ سین اور ”پدماوتی“ سے کنول سین پیدا ہوا۔ سنہل سے پلٹ کر رتن سین نے عنان حکومت پھر اپنے ہاتھوں میں لے لی اور رعایا کی صلاح و فلاح میں مشغول ہو گیا اور مدت تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

ایک دن جبکہ شاہی دربار میں سب درباری حاضر تھے۔ رتن سین نے دریافت کیا کہ ”دوج کب ہو؟“ تمام پنڈتوں نے ایک زبان ہو کر کہا ”کل“ لیکن راگھوچتن پنڈت نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ”کل نہیں بلکہ آج ہوگی“ اس پر بات بڑھی تو راگھو نے غصے میں آکر یہاں تک کہہ دیا کہ ”اگر دوج آج نہ ہو تو میں پنڈت نہیں۔“ اس دن تو راگھو کی چڑھ بنی لیکن دوسرے دن بھی چاند پہلے ہی روز کا سا نکلا تو معلوم ہو گیا کہ کل کا چاند راگھو کا علی معجزہ اور دھوکا تھا۔ دھوکے بازی کے جرم میں رتن سین نے راگھو کو جلا وطنی کی سزا دی۔

راگھو جیسے عالم کی جلا وطنی کوئی معمولی بات نہ تھی خاص کر اس وقت جبکہ وہ اپنے علم کے زور پر جو چاہے کر سکتا ہو۔ پدماوتی کو اس خفگی کا بڑا ڈر تھا وہ اُس کی ناراضگی کو ملک کے لیے بڑا سمجھتی تھی۔ راگھو کو خوش کرنے کے لیے پدماوتی نے اُسے محل کے نیچے بلوایا اور اپنا کنگن بھرو کے سے پھینکا۔ راگھو کے دل میں کھوٹ تو تھا ہی اُس

نے اس موقع کو رتن سین کی مضرت رسانی کے لیے بہت غنیمت سمجھا اور کنگن لے کر دلی کا ارادہ کیا۔ اس خیال سے کہ کنگن دکھا کر پداوتی کے حُسن کا ذکر بادشاہ دہلی یعنی علاؤ الدین سے کرے گا۔

راگھو کو معلوم تھا کہ علاؤ الدین حُسن پرست ہی وہ پداوتی کا ذکر سن کر چتور پر ضرور حملہ کرے گا اور اگر ایسا ہوا (جیسا راگھو کو یقین تھا) تو اس طرح راگھو رتن سین سے بدلا بھی لے گا اور دوسرا کنگن بھی — کینے کی بھینٹ میں رتن سین کی تباہی اور بقیہ دن آرام سے بسر کرنے کے لیے کنگن کی جوڑا اور دلی کا دربار شاہی۔

یہ سب سوچ کر راگھو دلی پہنچا۔ علاؤ الدین نے اس کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اپنا مہان رکھا اور سر جانامی ایلیچی کو خط دے کر رتن سین کے پاس روانہ کیا بادشاہ نے خط میں لکھا تھا کہ ”پداوتی کو فوراً بھیج دو اس کے بدلے میں جس قدر چاہے ملک لے لو“۔ خط کے پڑھتے ہی راجا رتن سین غصے سے لال ہو گیا اور اُسی غصے میں ایلیچی کو نکلوا دیا۔

جب اس طرح کام نہ نکلا تو علاؤ الدین نے چتور پر چڑھائی کی لیکن آٹھ برس کے محاصرے کے بعد بھی وہ اپنے مقصد میں ناکام ہی رہا اور قلعہ فتح نہ ہوا۔ اس درمیان میں علاؤ الدین کو خبر ملی کہ (ہردے والوں) یعنی مغلوں نے پھر حملہ کر دیا ہے۔ یہ معلوم کر کے بادشاہ نے رتن سین سے کہلا بھیجا کہ مجھے پداوتی نہیں چاہیے سمندر کی لڑکی لکشمی کے جو پانچ تحایف پداوتی کے پاس ہیں وہی مجھے دے دو۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔

راجا کے دو معتبر سرداروں یعنی گورا اور بادل نے آنکھ بند کر کے شاہی فوج پر بھروسہ کرنے سے رتن سین کو ہر چند روکا لیکن راجا نے ایک نہ سنی غرض بغیر مشورہ صلح کر لی اور اُسے قلعہ کے اندر لے گیا۔ راجا کا بادشاہ کو قلعہ کے اندر لے جانا ان کو اور بھی ناگوار ہوا اور وہ خفا ہو کر اپنے گھر چلے گئے، قلعے میں بادشاہ کی دعوت بڑے تزک و احتشام سے کی گئی اور اسی سلسلے میں کئی روز تک خوب جشن رہا۔

علاؤ الدین ایک دن ٹہلتے ٹہلتے پدماوتی کے محلوں کی طرف جانکا تو وہاں بہت سی پری جمال عورتیں اُسے نظر آئیں بادشاہ نے راگھو سے جو اُس کے ہمراہ تھا پوچھا کہ "اتن میں پدماوتی کون ہے؟" راگھو نے کہا کہ "پدمنی یہاں کہاں یہ سب تو اُس کی کنیزیں ہیں" یہ سن کر علاؤ الدین کو پدماوتی کے دیکھنے کا اشتیاق اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اور محض پدماوتی کے جلوے کی امید پر محل کے سامنے ہی بیٹھ کر شطرنج کھیلنے لگا۔ حسن اتفاق سے قریب رکھے ہوئے آئینے میں پدماوتی کا عکس پڑا۔ بادشاہ کی آرزو پوری ہوئی۔

غرض کئی روز مہمان رہ کر علاؤ الدین نے چتور سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا اور رتن سین اُس کے ہمراہ قلعے کے باہر تک پہنچانے کی غرض سے آیا۔ یہاں بادشاہ نے راگھو کے اشارے سے رتن سین کو قید کر لیا اور دلی لے جا کر ایک تنگ کوٹھری میں بند کیا جہاں اس پر طرح طرح کے ظلم ہونے لگے۔

رتن سین کے مخالف کھمبل میر کے راجا دیو پال کو جب راجا کے قید ہو کر دتی جانے کا حال معلوم ہوا تو اُس نے راجا کی غیر موجودگی سے

ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا اور کو مودنی نامی ایک عورت کو قاصد بنا کر بھیجا۔ پہلے تو پدماوتی اس سے یہ سمجھ کر کہ وہ اس کے میکے کی عورت ہو بہت خلوص سے ملی اور اپنا درد دل بھی سنایا لیکن بعد میں راز فاش ہو گیا اور کو مودنی بڑی بے عزتی کے ساتھ نکالی گئی۔ اسی طرح دلی پہنچ کر علاؤ الدین نے بھی جاسوسوں کے ذریعے سے پدماوتی کو زن سین سے ملانے کے بہانے بلوانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ چتوڑ میں سب کو معذور پا کر پدماوتی گورا اور بادل کے گھر گئی۔ ان سے راجا کے چھڑانے کی درخواست کی اور علاؤ الدین کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ ان دونوں نامور سرداروں نے کپٹ کے بدے کپٹ ہی کرنے کی سوچی کیونکہ بغیر چالاک کے علاؤ الدین سے پیش پانا مشکل تھا۔ کامیابی کی تدبیر سو جھی کہ سولہ سو بن پالکیوں میں سولہ سو سوڑا راجپوت سرداروں کو اور سب سے زیادہ مرصع اور قیمتی پالکی کے اندر اوزار کے ساتھ ایک لوہار کو بٹھلایا اور مشہور کر دیا کہ پدماوتی سولہ سو کنیزوں کے ساتھ دلی جا رہی ہے۔ غرض یہ پالکیاں مع چھو چھو کہاروں کے جو دراصل کہاروں کے بھیس میں راجپوت سپاہی تھے دلی پہنچیں۔ پہرے والے سنتریوں نے رشوت پا کر ان کا جائزہ بھی نہ لیا اور اس طرح بغیر روک ٹوک تمام پالکیاں قلعے کے اندر داخل ہو گئیں۔

لے گورا کے لڑکے بادل کی عمر کم تھی اور جس دن دلی جانا تھا اسی دن اس کا گونا گیا تھا۔ لیکن بہادر سپاہی کے دل میں جنگ کی جوائنٹ اور ملک کی عزت بچانے کا جو دلولہ تھا اُسے کوئی چیز روک نہ سکتی تھی اس نے لڑنے اور مرنے کا ارادہ کر لیا۔ ملک کی حفاظت اور اپنے راجا کی عزت کے ساتھ اس کا ذاتی عیش بے حقیقت تھا عزت کا حق ہر کہ عیش اُس پر قربان کر دیا جائے

قلعے میں پہنچ کر بادشاہ کے پاس یہ پیغام پہنچا کہ پدماوتی تو آگئی ہے لیکن وہ راجا سے مل کر خزانے کی کنجیاں اس کے حوالے کرنے کے بعد محل میں جانا چاہتی ہے چنانچہ سچی ہوئی پالکی رتن سین کے محبس تک پہنچا دی گئی پالکی سے نکل کر لوہار نے راجا کی بیڑیاں علیحدہ کر دیں اور وہ اُس گھوڑے پر سوار ہو گیا جو پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ راجا کے رہا ہوتے ہی تمام ہتھیار بند سپاہی بھی پالکیوں سے کود پڑے اور یوں گورا اور بادل رتن سین کو چھوڑ کر چتورے گئے۔ بادشاہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو راجپوتوں کا تعاقب کیا۔ راجپوتوں نے جب شاہی فوجوں کو پیچھے سے آتے دیکھا تو ایک ہزار سپاہیوں کو لے کر گورا ان کا مقابلہ کرنے کو رہ گیا اور بادل راجا کو لے کر چتور کی طرف بڑھا۔ بہادر گورا بڑی دیری سے لڑتا رہا لیکن آخر کار سر جا کے ہاتھوں مارا گیا اور راجا رتن سین چتور پہنچ گیا۔

چتور پہنچ کر رات کو اُس نے پدماوتی کے مُنہ سے دیو پال کے مکینہ پن کا حال سنا اور اسی وقت اس کو باندھ لینے کا عہد کیا۔ صبح ہوتے ہی رتن سین نے کھمبل میر پر حملہ کر دیا۔ رتن سین اور دیو پال کے درمیان سخت معرکہ ہوا۔ آخر کار رتن سین نے دیو پال کا سر کاٹ کر اس کے ہاتھ پاؤ باندھے۔ گویا اپنے عہد کو پورا کیا۔ لیکن خود بھی دیو پال کے زخم سے جانبر نہ ہو سکا اور چتور کی حفاظت کا بار بادل پر ڈال کر اہی ملک عدم ہوا۔ راجا کی لاش کے ساتھ پدماوتی اور ناگمتی دونوں رانیاں سستی ہو گئیں۔

اتنے میں شاہی فوج چتور گڑھ آ پہنچی۔ بادشاہ نے پدماوتی کے

سستی ہونے کا حال سنا۔ بادل نے جیتے جی قلعے کی حفاظت کی لیکن جب وہ ”پھاٹک“ کی لڑائی میں مارا گیا تب چپورا اسلامی فوجوں کے ہاتھ لگا۔

کہانی کا تاریخی رخ | ملک صاحب کی لکھی ہوئی یہ کہانی دونمیاں حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ایک تو

زن سین کے سنہل دیب جانے اور وہاں سے چپورہ پلٹنے تک کی سرگزشت، جسے کسی عنوان سے بھی تاریخی واقعہ نہیں تو داستان محبت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ وہی کہانی ہے جو اودھ میں مشہور ہے۔ یعنی رانی اور توتے کی کہانی، لہ شمالی ہند خاص کر اودھ میں رانی اور توتے کی کہانی اب تک مشہور ہے اور اسی طرح بیان کی جاتی ہے جس طرح ملک صاحب نے اسے نظم کیا ہے۔ فرق صرف ناموں کے استعمال کا ہے۔

یہ کہانی بیچ بیچ میں گا گا کر کہی جاتی ہے۔ مثلاً راجا کی پہل رانی آئینے میں اپنا منہ دیکھتی ہے۔ تو توتے سے پوچھتی ہے۔

دیس دیس تو ی پھر یے ہو سوئیٹا مورے روپ اور کہوں کوئے

دےس دےس تو فیرے ہو سوئیٹا

مورے روپ آویر کھو کوئی

ترجمہ { اے توتے تو تو ملک ملک گھوما ہے میری صورت کا کہیں دوسرا بھی ہے۔
تو تا جواب دیتا ہے:-

کا کھیا نو سنہل کی رانی تیرے روپ بھرین سب پانی

का बखानु सि न्हल की रानी

तोरे रूप भरै सब पानी

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱ پر ملاحظہ کیجیے

ملک محمد نے ناموں کے تعین سے اُسے ایک نئی چیز ضرور بنا دیا ہو لیکن محض ناموں کا اضافہ کر دینے سے کہانی کو امر واقعہ کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ سنگدب میں چوہان خاندان کے کسی راجا کا سرے سے وجود ہی نہ ہو اور خوبصورت عورتوں کی پیداوار کے لیے اس سرزمین کا سازگار ہونا بھی مشکوک ہو۔ پھر ایسے دُور دراز مقام کے سفر کا قصد کرنا عہدِ علانی میں ایسا آسان بھی نہ تھا جیسا کہ شیرشاہ یعنی خود ملک صاحب کے زمانے میں ہو گیا تھا اور وہ بھی محض توتے کے بیان پر — یہ سچ ہو کہ ہندی شاعری میں توتے کا درجہ بہت بلند ہو اور اُس کی گفتگو میں اکثر سمجھ اور ارادہ پایا گیا ہو۔ تاریخوں میں بھی اکثر واقعات توتے کی زیر کی کے درج ہیں۔ لیکن یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰

ترجمہ { سنہل کی رانی کا کیا ذکر کروں وہاں بھاری جیسی تو پانی بھرتی ہیں۔ اس قسم کی اور بھی کہانیاں اودھ میں رائج ہیں جو گا گا کر کہی جاتی ہیں مثلاً بالاکھن دیو کی کہانی۔

۱۔ مرآۃ سکندری، تاریخ گجرات میں ایک واقعہ شہنشاہ ہمایوں کے زمانے کا درج ہو۔ جب ہمایوں نے گجرات کے فرمانروا بہادر شاہ پر فوج کشی کی تو اُس نے اپنی تمام تر قوت قلعہ جاپانیر کے حاصل کرنے میں صرف کر دی پھر بھی فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ قلعہ جاپانیر بہادر شاہ کا مستقر اور اس کی قلمرو کا سب سے زبردست قلعہ تھا۔ سلطان بہادر کا اسلحہ خانہ اور مال و دولت سب اسی قلعے میں تھی۔ دورانِ جنگ میں بہادر شاہ کا معتمد سپہ سالار رومی خاں اور میراتش یعنی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲ پر ملاحظہ کیجیے

کوئی قطعی دلیل اس کی نہیں ہو سکتی کہ ملک صاحب کی کہانی کے اس حصے کی بنیاد کسی واقعے پر رکھی گئی ہو۔ کہانی کے اس حصے میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱

ناظم توپ خانہ ہمایوں سے مل گئے اور اپنی سازش سے قلعے پر ہمایوں کا قبضہ کر لیا۔ فتح کے بعد جب وہاں کا مال غنیمت ہمایوں کے دربار میں پیش کیا گیا تو اُس میں ایک زبان داں تو تا بھی تھا جو آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ جس وقت ہمایوں کے سامنے پیش ہوا اور اس کی صفت بیان ہونے لگی تو اُسی وقت چوب دار نے عرض کیا ”رومی خاں حاضر ہو“ اسے باریابی کی اجازت دی گئی جیسے ہی وہ تخت شاہی کے سامنے آکر آداب بجالایا۔ توتے نے اُس کی صورت دیکھتے ہی کہا ”ہٹ پاپی رومی خاں نمک حرام“ توتے کے اس کلمے سے رومی خاں کی آنکھیں ندامت سے جھک گئیں سارا دربار متحیر ہو گیا۔ ہمایوں نے کہا ”رومی خاں چہ کنم جانور است ورنہ زبانش بریدم“ (رومی خاں کیا کروں یہ جانور ہو ورنہ اس کی زبان کاٹ لیتا) اسی طرح انگریزوں میں بھی توتے کے باتیں کرنے کے واقعات مشہور ہیں۔ مثلاً رابنسن کروسو (ROBINSON CRUSOE) کے افسانے (جو بعضوں کے نزدیک تاریخی واقعات ہیں) اُن میں ایک ایسے توتے کی باتوں کا ذکر ہے جس سے غربت و بیکسی میں اُسے مدد ملی تھی۔ توتے کی فہانت کے ان تاریخی یا بظاہر تاریخی واقعات کے علاوہ اور قصے بھی مشہور ہیں مثلاً فسانہ عجایب کا آغاز بھی توتے سے ہوتا ہے۔ جان عالم نے ایک تو تا مول لیا۔ گھر میں لایا اس کی ملکہ نے اپنے حُسن پر ناز کیا۔ توتے نے اُس کے حُسن کی مذمت کی اور ایک دوسری چہ جبین انجم آرا کے حسن کی تعریف کر کے جان عالم کو اس کے عشق میں مبتلا کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مختلف ماہیت اور اقسام کے خیالی سمندروں، رتن سین کے امتحانِ شوق، راکششوں کی مردم آزاری، تمدن اور معاشرت اور اسی قسم کے متعدد کچھ ایسے تذکرے آگئے ہیں جن سے نتیجہ صریح نکلتا ہے کہ یہ حصہ یا تو ہندوؤں کے مذہبی افسانوں سے اخذ کیا گیا ہے یا خود ملک صاحب کے زمانے کی ذاتوں، پیشوں، لباس، رسم و رواج، معاشرت، میلے، ٹھیلے، بیاہ، برات وغیرہ کے چٹم دید واقعات پر مبنی ہے اور یا شاعر جاسی کے زور تخیل کا نتیجہ ہے جو بھی ہو یہ حصہ کسی طرح بھی نہ تو عہدِ علاؤ الدین سے متعلق کہا جاسکتا ہے اور نہ کلیتاً شیر شاہ کے زمانے سے۔ دوسرے حصے میں راگھو کے نکالے جانے سے لے کر پدم اوتی کے سستی ہونے

بلکہ یوں کہیے کہ چتور فتح ہونے تک کے حالات شامل ہیں۔ اس حصے کو مختلف تذکروں، تاریخوں اور قصوں میں بیان کیا گیا ہے اور متعدد لوگوں نے اُسے مختلف زبانوں یعنی فارسی، اردو، ہندی، مرہٹی،

۱۔ حسین غزنوی نے بہد فرخ سیرا سے فارسی میں نظم کیا اور قصص پداوت نام رکھا جس کا ایک نسخہ دہلی کے کتب خانہ عام (ہارڈنگ لائبریری) میں محفوظ ہے۔
۲۔ رائے گو بند ششی نے اس کہانی کو فارسی میں لکھ کر تحفۃ القلوب کے نام سے موسوم کیا۔

۳۔ اُن کے بعد ضیاء الدین عجمت اور غلام علی عشرت نے مل کر ۱۷۶۶ء میں اس کہانی کو اردو نظم میں منتقل کیا۔

۴۔ ۱۸۶۳ء میں محمد قاسم علی صاحب بریلوی نے ملک صاحب کے پداوت کا ترجمہ اردو نظم میں کیا۔ اور ۱۸۹۸ء میں مرزا عنایت علی بیگ عنایت لکھنوی نے بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۴ پر ملاحظہ کیجیے۔

بنگالی اور گجراتی وغیرہ میں منتقل کر کے ایسی شہرت دے دی ہو کہ اب اُسے ایک تاریخی امر واقعہ کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ہو۔ یہاں تک کہ کرنل ٹاڈ مولف "تاریخ راجستھان" نے اس قصے کو اکبر اعظم کے عہد میں "کھمان راسا" یعنی چتور کے قومی شاہ نامے اور کاغذات سے اخذ کر کے انگریزی میں نقل کیا اور ابو الفضل نے آئین اکبری میں اس افسانے کو جگہ دی پھر عہد جہانگیری میں غلام حسین نے تاریخ فرشتہ میں قدرے تغیر کے ساتھ اُسی افسانے کو لکھا۔

عہدِ علانی اور اُس کے عین مابعد کے مورخین میں امیر خسرو دہلوی، نظام الدین اور مولانا عصامی اور ضیاء الدین برنی نے چتور کے حملے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمان تذکرہ نویسوں میں امیر خسرو نے جو چتور کے حملے میں بادشاہ کے ساتھ تھے مقابلتاً تفصیلی ذکر کیا ہے۔ آئین اکبری میں بھی مفصل تذکرہ فتح چتور کا ملتا ہے۔ برنی اور فرشتہ دونوں نے تفصیل نہیں دی اور نظام الدین نے تو چند سطروں ہی پر اکتفا کی ہے۔

نفس معاملہ کے متعلق امیر خسرو کا بیان صرف اس قدر ہے کہ قلعہ چتور دو شنبہ کے دن ۱۱ محرم الحرام ۹۳۷ھ مطابق ۳۰۳ء کو فتح ہوا۔ رائے بھاگا لیکن بعد میں اُس نے اپنے کو بادشاہ کے حوالے کر دیا تین ہزار

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳

پداوت کو اُردو نثر میں منتقل کیا

منظوم ترجمہ مطبع لوکسور میں اور نثر والا ترجمہ مطبع اعظمی کا پور میں

طبع ہوا

۵۔ مولوی محمد حسین آزاد نے قصص ہند میں اسے نقل کیا۔

ہندوؤں کے قتل کا حکم دینے کے بعد علاؤ الدین نے چتور کی سلطنت اپنے بیٹے خضر خاں کے حوالے کی چتور کا نام خضر آباد رکھا۔ خلعت، ایک سُرخ شامیانہ اور رایت سبز و سُرخ خضر خاں کو دے اور اُس پر نعل و یاقوت بچھا کر کیے۔ پھر دلی پہنچا۔

مسلمان تذکرہ نویسوں کے یہاں تفصیل نہ ہونے کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ یعنی یہ کہ اُن کے بیانات خاص خاص باتوں میں راجپوتوں کی روایات کی رد کرتے ہیں اور پدمنی کے افسانے یعنی اُس کے عشق میں علاؤ الدین کے چتور فتح کرنے اور اُسے نہ پانے کا تو سوا آئین اکبری کے کہیں ذکر بھی نہیں ہے۔

اگر اس حملے کا اصل سبب پدمنی کا حُسن ہوتا تو قرین قیاس نہیں کہ امیر خسرو کا سا شاعر اور اہل دل خزائن الفتوح میں چتور کے حملے کا ذکر کرنے کے باوجود اس واقعے کو یوں نظر انداز کر دیتا جیسے ہوا ہی نہیں اور علاؤ الدین کے فتح چتور اور دیگر فتوحات کے بارے میں اس تصنیف میں صفحے کے صفحے رنگ ڈالتا یا نظام الدین اپنی طبقات اکبری میں چتور کی فتح کے لیے چند سطریں کافی سمجھتے۔ یا شاہ نامہ مولانا عصامی دہلوی موسوم بہ فتوح السلاطین مصنفہ ۱۳۵۱ھ میں اس سلسلہ شاہ نامہ مسلم فاتحین ہند کی ایک نایاب تاریخ ہے جو سلطان علاؤ الدین حسن گنگو بانی خاندان بہمنی کی سرپرستی میں اس کی فرمائش پر ۱۳۵۱ھ میں فارسی زبان میں نظم ہوا تھا۔ ڈاکٹر آغا مہدی حسن ایم۔ اے اگرہہ کالج کی نگرانی میں مرتب ہو کر حال ہی میں اگرہہ سے شایع ہوا ہے۔ اصل شاہ نامے کی ایک نقل کتب خانہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

واقعے کا جیسا کہ مشہور ہے ذکر نہ ہوتا۔ حالانکہ خلیفوں کے عہد کو مولانا نے بچپن میں خود بھی دیکھا تھا اور اس شاہ نامے میں علاؤ الدین کی فتح چٹوڑ کا ذکر بھی موجود ہے۔ عہد علانی اور نیز اس کے عین مابعد کے مؤرخین میں سے ایک کا بھی چٹوڑ کی فتح کے سلسلے میں اشارتاً پد منی کے وجود کو علاؤ الدین کی چڑھائی سبب قرار نہ دینا بہتہ دیتا ہے کہ ان کے نزدیک اس حملے کو کوئی معاشقانہ اہمیت حاصل نہ تھی۔ قراین کے علاوہ واقعات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ چٹوڑ پر علاؤ الدین کا حملہ اُسی جذبہ حصولِ نام و نمود کا مرہون منت تھا۔ جس کی بنا پر وہ سکندر ثانی بنا چاہتا تھا کہ چٹوڑ میں پد منی کے وجود کا ضیاء الدین برنی مؤلف تاریخ فیروز شاہی نے اس حملے کا سبب شرح و بسط کے ساتھ درج کیا ہے۔ مؤلف تاریخ فرشتہ نے انہیں سے نقل کر کے اپنی کتاب میں اسے درج کیا ہے۔ ضیاء الدین برنی عہد علانی کے ہم عصر مؤرخ اور اس واقعے کے ناقلِ اول یعنی علاء الملک کو تو ال دہلی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ اس لیے واقعات اور اشخاص متعلقہ کے متعلق ان کا علم عینی ہے۔ علاوہ فرشتہ کے انگریز محققین نے بھی ان کے معلومات سے خوشہ چینی کی ہے۔ فرشتہ کے منقولہ بیان کا آزاد ترجمہ یہ ہے ”جب تخت نشینی کے تین ہی سال کے اندر علاؤ الدین کی تمام آرزوئیں پوری ہو گئیں۔ گجرات جیسا ملک فتح ہو گیا۔ اور حدود مملکت میں کوئی اُس کا معارض نہ رہا تو اُس کے دل و دماغ میں عجیب و غریب خیالات چکر لگانے لگے۔ اکثر ارکانِ دولت سے ”دقت“ کہا کرتا کہ ”جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے چار پار کی موافقت سے ایک شریعت یادگار چھوڑی۔ میں بھی اپنے چاریار۔ اُلغ خاں، الپ خاں، ظفر خاں اور نصرت خاں کی امداد سے ایک نئے مذہب و شریعت کی بنیاد ڈال سکتا ہوں اور اگر دہلی کو کسی خیر خواہ کے سپرد کر کے ان سواروں، ہاتھیوں اور پیادوں کو جو بکثرت جمع ہو گئے ہیں ساتھ لے کر سکندر اعظم کی طرح عزمِ جہانگیری کروں تو خراسان و ترکستان و ماوراء النہر فتح کر کے فارس، عراق، شام، روم اور حبش وغیرہ کو تسخیر کر لوں۔“

جب دولاکھ خونخوار مغلوں کے لشکر پر علاؤ الدین کو فتح حاصل ہوئی تو غرور و تکبر کی اور بھی حد نہ رہی پھر کیا تھا خطبے میں ”سکندرتاشی“ پڑھا جانے لگا اور سکون اور فرمانوں کو اس لقب سے زینت دی جانے لگی۔ اہل بزمِ دل میں تو ان مہلات پر سنستے البتہ رعبِ شاہی سے کچھ نہ کہہ سکتے بزرگانِ دین مثل حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ ان ہفوات کو سن کر رنجیدہ ہوتے اور سلطان کے راہِ راست پر آنے کی دعا فرماتے۔

ایک روز علاء الملک کو توال دہلی سے بادشاہ نے اپنے ارادوں کا ذکر کیا اور ان کے متعلق اس کی رائے دریافت کی۔

علاء الملک کسی قدر ذی علم اور سچا دین دار تھا دل میں سوچا کہ عمر ختم ہونے کو آتی۔ چند دنوں کے لیے بادشاہ کی خوشامدیں آخرت خراب کرنا ٹھیک نہیں۔ بادشاہ کے چشم و ابرو دیکھنے کے بجائے سچ کہہ دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ کلمہ حق کہنے پر اگر قتل بھی کر دیا گیا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ زندگی کی تلخی سے شہادت کی شیرینی بہتر ہے۔

چنانچہ اُس نے عرض کیا کہ ”اگر حضور شراب اُٹھوادیں اور
تخلیہ ہو جائے تو جو کچھ مجھ کم عقل کا خیال ہے عرض کروں“
جب شراب اور اغیار سے محفل خالی کر دی گئی اور علاوہ
علاؤ الدین اور اُس کے چار یار کے اور کوئی وہاں نہ رہ گیا تو
علامہ الملک نے کہا

”دین و شریعت کا تعلق وحی آسمانی سے ہے جو انبیاء علیہم السلام
پر نازل ہوا کرتی تھی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اُس کا
دروازہ بند ہو گیا۔ حضور پر بخوبی روشن ہے کہ حضور پر کوئی وحی نازل
نہیں ہوتی۔ پس جو کوئی حضور کے اس دعوے کو سُننے کا آپ سے
نفرت کرے گا۔“

دین و ایمان ایک عزیز شے ہے۔ اُس کی حفاظت کے لیے
ہر مذہب و ملت کے لوگ بے خطرہ ہو کر بغاوت کریں گے۔ اور عظیم
فتنے رونما ہوں گے جن کا تدارک مشکل ہو گا۔ اور لوگ ہم لوگوں کو
بھی بانی فساد سمجھ کر ہماری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔ لہذا حضور
کے دولت و اقبال کے لیے یہی مناسب ہے کہ آئندہ ایسے لوگوں کو
ہرگز دل میں جگہ نہ دیں اور نہ اُس کا تذکرہ فرمائیں۔ حضور کو علم
ہے کہ چنگیز خاں اور اُس کی اولاد نے ہر طرح کے ظلم و تشدد سے
دین محمدی کو مٹانے کی تدتوں کو شش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ آخر کار
دین اسلام کی غوبی اور استواری دیکھ کر اُس کے بیٹے پوتوں نے
اسلام قبول کیا اور کفار یورپ سے جہاد عظیم کیا، رہا حضور کا دوسرا
خیال وہ بنفسہ بہت درست اور حضور کی ہمت شاہانہ کی دلیل ہے۔

لیکن اگر حضور مالک ایران وغیرہ گئے اور عرصے تک نہ پلٹے تو یہاں کون اس لائق ہو کہ نیابت کا کام انجام دے سکے۔ اس زمانے کو سکندر کے عہد پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اُس وقت غدر اور بدامنی شاذ تھے اور پھر سکندر کا وزیر ارسطو جیسا حکیم اور فلسفی تھا۔

اگر حضور کے پاس ایسے بھروسے کے لوگ ہوں تو یہ رائے عین ثواب ہے۔“

بادشاہ نے غور و تامل کے بعد پوچھا کہ ”اچھا اگر میں اس ارادے سے باز آؤں تو یہ لشکر کثیر اور خزانے کس کام آئیں گے اس گوشہ دہلی پر توقاعت نہیں ہو سکتی۔“

علامہ الملک نے عرض کیا کہ ”حضور کے حدود و اقلیم سے قریب ہی مہات خطیر موجود ہیں مثلاً رن تبھور، چتور، چندیر، دھانگری اور پورا مالوہ۔ ان کے علاوہ بہت سے دوسرے علاقے ہیں جو اسلام کے مغرور متمرّد دشمنوں کے قبضے میں ہیں جن سے سلطنت اسلامی کو اندیشہ ہے پہلے ان کو فتح کر لینا چاہیے بعد کو دنیا کی فتح کا خیال ہونا چاہیے۔“

بادشاہ نے اس گفتگو کے بعد ہی اُسی مجلس میں اُلخ خاں سپہ سالار اعظم کو حکم دیا کہ رن تبھور پر حملے کی تیاری کرے۔ چنانچہ اس نے محاربہ رن تبھور کی تھکی ہوئی فوج نے دم لیا اور ۲۰۰۰ میں علاؤ الدین نے علامہ الملک کو قوال کی ہدایت کے مطابق چتور پر حملہ کیا جو اُس کے پروگرام میں دوسرے نمبر پر تھا۔ عہد علانی کے مورخین کے سکوت، برنی کی نقل کی ہوئی اس تاریخی گفتگو

اور ملک محمد جاسی سے قبل کسی تذکرہ نویس کے پدمنی کے عشق میں علاؤالدین کی چتور پر فوج کشی کرنے کا ذکر نہ ہونے کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے جس نے اس معروضہ واقعے کا ذکر کیا ہے وہ ملک محمد جاسی ہیں اور علاؤالدین اور پدمنی کے معاشقے کی داستان دراصل ان کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ البتہ بعد میں مورخین واقعہ نگاروں اور افسانہ نویسوں غرض سبھی نے ملک صاحب کی بیان کی ہوئی کہانی سے خوب خوب خوشہ چینی کی — اور اکبر اعظم کی چتور پر فوج کشی کے سلسلے میں جب پدماوت راجپوت رجواڑوں کے بکیشروں (بھاٹوں) کے ہاتھ لگی تو انھوں نے واقعات کی بنا پر نہیں بلکہ خوشامد اور تملق کی آڑ میں ملک صاحب کی زبان سے سُنی ہوئی کہانی پر خوب خوب حاشیے چڑھائے اور اسے مبالغہ آمیز طریقے پر بطور واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا، چونکہ یہ کہانی اُسی زبان میں تھی جسے وہ بولتے اور سمجھتے تھے اس لیے وطنیت اور قومیت کے جذبات بھڑکانے میں بھی اس وقت سے خاصی مدد ملی جانے لگی۔

ابوالفضل جیسے راجپوتوں کے دلدادہ کو جب یہ ماخذ ملا تو کہانی کی جاذبیت پر نقل کرتے ہوئے دریا بہا دیے۔ اس طرح کہانی تیار ہو گئی۔ یعنی پدماوتی پر علاؤالدین کے فریفتہ ہو کر اس کے حاصل کرنے کے لیے چتور پر حملہ کرنے کی فرضی داستان کو ایسی تاریخی اہمیت اور خصوصیت حاصل ہو گئی کہ عرصے تک کسی کو اس کی رد اور تغلیط کی طرف توجہ ہی نہ ہو سکی۔

۱۔ اس افسانے پر بھی حال ہی میں محمد احتشام الدین دہلوی ایم۔ اے (علیہ)
بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱ پر ملاحظہ کیجیے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک صاحب نے پدماوت شیر شاہ پوری کے زمانے میں لکھی تھی۔ پھر انھوں نے کیوں ایک فرضی قصے کو تاریخی اہمیت دے دی اور اگر علامہ الدین نے چتور پر پدمنی کے حاصل کرنے کے لیے حملہ نہیں کیا تھا تو وہ علامہ الدین کی طرف ایک بے بنیاد واقعے کو منسوب کر کے ایک جلیل القدر اسلامی بادشاہ کو عوام کی نظروں میں سبک کرنے کا سبب کیوں بنے؟

ملک صاحب تاریخ نہیں لکھ رہے تھے، وہ تو ایک تلمیذی ثنوی کی طرح ڈال رہے تھے اور اس اعتبار سے اُن تمام واقعات سے اپنے شاعرانہ تخیلات کو زینت دینے کا خیال اُن کے آگے آگے تھا جن سے ثنوی میں روح اور مضمون میں دلچسپی پیدا ہو۔ خصوصاً جبکہ ایسے واقعات عہد علامہ الدین میں نہ سہی شیر شاہ کے زمانے میں جبکہ پدماوت لکھی گئی ہو، پیش بھی آچکے ہوں مثلاً

(۱) گو علامہ الدین کے زمانے میں رتن سین نام کا کوئی راجہ چتور میں نہ تھا۔ البتہ شیر شاہ کے عہد میں رانا سانگا کا جو بیٹا چتور کا حکمران تھا اس کا نام رتن سین تھا۔ یہ جلیل القدر بھی تھا اور رفیع المنزلت بھی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۰

نے اپنی تصنیف ”افسانہ پدمنی“ مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں جو تبصرہ کیا ہے وہ البتہ کافی مفصل ہے۔

۱۔ اُس وقت کے والی چتور کا نام سنورسی تھا جسے چتوری سمرسی، سمر سین اور سمر سنگھ کہتے ہیں۔

(۲) فتوح السلاطین مصنفہ عصابی دہلوی)

ملک صاحب نے اپنی داستان کو پُر شکوہ بنانے کے لیے بادشاہوں میں علاء الدین کو جو سکندر ثانی بننے کا دعوے دار تھا، منتخب کر لیا اور راجاؤں میں زن سین کو جو ہر اعتبار سے سرآمد راجکان تھا۔ (۲) ڈولیوں میں عورتوں کے بجائے راجپوت سپاہیوں کا بیٹھ کر علاء الدین کے قلعے میں کھس جانے کا جو تذکرہ ملک صاحب نے کیا، وہ بھی شیر شاہ ہی کے عہد کا ہے۔ بلکہ خود شیر شاہ کا واقعہ ہے اور قریب قریب اُسی وقت کا جبکہ ملک صاحب مثنوی لکھ رہے تھے ملاحظہ ہو:-

”ہمایوں کو صوبہ بہار سے نکال کر شیر شاہ کو بنگالہ کی ہوس ہوئی مگر اہل و عیال اور خزانے کے لیے متفکر تھا کہ خود ہم پر جائے تو اُن کو کہاں محفوظ چھوڑ جائے؟ قلعہ رہتاس اپنی عظمت اور مضبوطی کے لیے نہایت مشہور اور اس مقصد کے لیے از حد موزوں تھا۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد شیر شاہ نے راجا کو لکھا کہ میں بنگالہ جاتا ہوں اور اپنے اور اپنے سردار و سپاہ کے اہل و عیال اور خزانہ تیری حفاظت اور دوستی کی پناہ میں چھوڑتا ہوں اگر زندہ بچا تو حق خدمت ادا کروں گا۔ ورنہ خزانہ تجھ کو مبارک اور ہمارے ناموس اہل و عیال مغلوں کی بہ نسبت، جو ہمارے دشمن ہیں، تیری حفاظت میں زیادہ محفوظ رہیں گے“

”راجا نے اس پیام کو خزانے کے لالچ میں قبول کر لیا۔ ایک ہزار ڈولیوں میں دو ہزار مسلح افغان دو ہزار کھار ڈولیوں کے اور ایک ہزار مزدور خزانے کی اشرفیوں کے جو سب کے سب سپاہی تھے۔ قلعہ

کو روانہ ہوئے آگے کی چند ڈولیوں میں مصلحتاً بوڑھی عورتیں بٹھادی گئی تھیں اُن کی سرسری تلاشی کے بعد تمام زنانہ اور خزانہ قلعے میں داخل کر لیا گیا۔ اندر پہنچتے ہی سوری افغان تلواریں سونت ڈولیوں سے نکل پڑے۔ خزانے کے مزدور اور ڈولیوں کے کھار بھی سپاہی بن گئے اور قلعے کے دروازے شیر شاہ کے لیے جو قریب ہی کان لگائے کھڑا تھا کھول دیے گئے۔ راجا بھاگا اور قلعے پر شیر شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ (منقول از فرشتہ)

ملک صاحب نے افغانوں کے واقعے کو راجپوتوں سے منسوب کر کے علاء الدین کے پدمنی کے حصول کی کوششوں کی رد کرنے کو اس کا سبب قرار دے اپنی نظم کو کافی دلچسپ اور ہنگامہ خیز بنا دیا۔ (۳) ملک محمد جاسی ہی کے زمانے میں شیر شاہ کے ہم عصر سلطان بہادر گجراتی نے ۹۳۵ھ میں (پدماوت کی تصنیف سے صرف نو برس پہلے) سلہدی نامی راجا راسیوں پر چڑھائی کی تھی مقصد اس لشکر کشی کا یہ تھا کہ راجا کے زنان خانے سے تقریباً ڈھائی سو ایسی مسلمان عورتوں کو آزاد کر دیا جائے جن کو اُس نے اپنے تعیش کے لیے محل میں نظر بند کر رکھا تھا۔ جب بچاؤ کی کوئی صورت بن نہ پڑی تو رانی نے ایک بہت بڑی چٹا مشتعل کرائی تاکہ رنواس (محل) کی تمام عورتوں سمیت جوہر کرے اور یہ معلوم کرے کہ لشکر کشی کا سبب محل کی نظر بند مسلمان عورتوں کو رہائی دلانا ہے۔ اُس نے ان مسلمان عورتوں کو بھی آگ میں زبردستی بھونک دیا۔ جو قلعے میں قید تھیں۔ قلعہ فتح ہوا۔ لیکن بجز راکھ کے ایک ڈھیر کے سلطان کو راجا نے غنیمت کے استیلا کے وقت راجپوتوں کی عورتیں اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے خود کو نذر آتش کر دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے

کے زمانہ خانے کا نشان بھی نہ ملا۔ چنانچہ شاعر جاسی نے اس غم انگیز واقعے کو علاء الدین کے حملہ چٹوڑ سے منسوب کر کے پدمنی کے جوہر کرنے کا تذکرہ کر دیا ہے۔

(۴) ایک اور ثبوت بھی پدمات کے فرضی قصہ ہونے اور خود شاعر جاسی کے زمانے کے واقعات سے متعلق ہونے کا ہے یعنی یہ کہ عہد علانی میں قلعہ کھیلینر کا وجود بھی نہ تھا جس کا ذکر ملک صاحب نے کیا ہے۔ البتہ پدمات کے زمانے میں ایک قلعے کی تعمیر کھیلینر میں ہوئی تھی جو اپنی مضبوطی اور استحکام کی وجہ سے کافی مشہور ہو گیا تھا۔

(۵) ایک بات اور بھی ہے جو علاؤ الدین خلجی کے نام کو منتخب کرنے اور اس فرضی واقعے کو اس کی طرف منسوب کرنے کی ضمن میں کہی جاسکتی ہے یعنی یہ کہ عہد علاء الدین کے صدیوں بعد ملک محمد جاسی کے زمانے کے لگ بھگ ایک سلطان مالوہ میں گزرا ہے جس کا نام غیاث الدین خلجی تھا۔ مانڈوا اس کا دارالسلطنت تھا اور اس کی حکومت کے حدود کے ڈانڈے جا بجا چٹوڑ سے ملے ہوئے تھے اور اکثر باہم محاربات رہتے تھے۔ اس کے بارے میں فرشتہ نے لکھا ہے کہ ”اُس کو خوبصورت عورتوں کے جمع کرنے کا عجیب شوق تھا۔ ہزاروں خوبصورت عورتوں کا ایک شہر بسایا تھا۔ کسی بد صورت کا گزرنہ تھا۔ عورتیں ہی امیر، وزیر، قاضی، مفتی، کوٹوال، محتسب، خزانے دار غرض جملہ عہدوں پر مامور تھیں، عورتیں ہی دکان داری، تجارتی، آہن گری، پہلوانی، شعبہ بازی اور دوسرے تمام صنعتوں اور پیشوں کو انجام دیتی تھیں۔ راجاؤں کی بیٹیوں اور امیروں کی دختروں کو زنا نے

میں وہی منصب، خطاب اور عہدے ملے ہوئے تھے جو باہر راجاؤں اور امیروں کو حاصل تھے۔ ایک دستہ ترک عورتوں کا مردانہ لباس میں — اور ایک دستہ حبشی عورتوں کا — مقرر تھا۔ نیزے لیے ترکش لگائے مکر بستہ پہرہ دیا کرتی تھیں۔

اگرچہ ہزار ہا حسین عورتیں اُس کے شہر حسن آباد میں جمع ہو گئی تھیں پھر بھی سلطان کو یہی حسرت تھی کہ جیسے حسن اور صورت کو دل چاہتا تھا ہنوز میسر نہیں آتی۔ آخر اس کے ایک مقرب نے بیڑا اٹھایا کہ وہ بادشاہ کے واسطے حسین ترین عورت (پدمنی) تلاش کر کے لائے گا۔

چنانچہ اُس کی تلاش میں دیں دیں مارا پھر آخر مایوس ہو کر پلٹا جب اپنے بادشاہ کے علاقے میں واپس قدم رکھا تو کسی موضع میں ایک دوشیزہ جاتی ہوئی نظر پڑی جس کی رفتار و قامت ہی پر وہ حیران رہ گیا صورت دیکھی تو اپنے مطلوب سے بھی بہتر پایا۔ آخر وہیں رہ پڑا اور جس حیلے سے بھی ہو سکا اُس حسینہ کو اڑا کر بادشاہ کی خدمت میں لا پہنچایا۔

بادشاہ بھی نہایت خوش ہوا اور بیش قرار صلہ مرحمت فرمایا۔ اسی اثنا میں اُس دوشیزہ کے ورثا بھی فریاد کرتے آ پہنچے اور سر راہ بادشاہ سے اُس شخص کے خلاف داد چاہی۔

ورثا کو جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکی بادشاہ کے محل میں ہے تو اُنھوں نے باعث شرف و سعادت سمجھ کر بادشاہ کو بخوشی معاف کر دیا۔
(راخوذا از فرشتہ)

چنانچہ ملک صاحب نے تنثیل کے اعتبار سے غیاث الدین خلجی کے بجائے علاء الدین کے نام کی تحریف کر دی۔ جو شہرت و عظمت میں غیاث الدین سے کہیں زیادہ مشہور تھا اور ”پدمنی“ یعنی حسین ترین عورت کی جستجو کی کھٹاؤں کر انھوں نے اپنی بلند فکری سے نظم کی روح و روان کا نام بھی پدمنی رکھ دیا۔

اس کے علاوہ چتور کے ایک ہندی کتبے کی شہادت بھی اس دلیل کی تائید میں موجود ہے۔ جو اوڑے پور راج میں بطور آثار قدیمہ محفوظ ہے۔ اور وہ اکلنگاجی کے کتبے کے نام سے مشہور ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بادل گورا نامی سردار نے مانڈو کے غیاث الدین خلجی سلطان مالوہ کو سب ۱۵۴۵ء (مطابق ۱۶۴۸ء) میں اس جگہ نیچا دکھایا۔ سینکڑوں مسلمان روزانہ قتل کیے۔

جس جگہ وہ قتل کیے گئے وہ بروج قلعہ بھی ”بادل سرینگا“ کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

اس کتبے سے میواڑ کے محققین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ملک محمد جاسی کی مشنوی پدماوت میں جو گورا بادل نام کے دوسرے ذکر ہوئے ہیں۔ وہ حقیقت میں ایک شخص ہے یعنی یہی گورا بادل جس کا نام کتبے میں لیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس خلجی سلطان مالوہ کو کسی نے چتور کے رانا کے محل میں پدمنی کے وجود کی خبر دی ہو اور اُس نے اشتیاق میں چڑھائی لے گورا میواڑ کے ایک قبیلے کا نام ہے۔

لے رتن سین خلف رانا سانگا اور غیاث الدین خلجی ہم عمر تھے۔ کہنے کے بموجب گورا بادل نے اسی غیاث الدین کو نیچا دکھایا ہوگا۔

کی ہو۔ محاصرے میں گورا بادل نے اُس کے دانت کھٹے کیے ہوں لیکن یہ بھی ایک طاقتور سلطان تھا۔ آخر صلح ہو گئی ہو اور رانی کو آئینے میں دکھا دینے کی شرط قرار پائی ہو اور سلطان آئینے میں صورت دیکھ کر چلا گیا ہو۔ لیکن چونکہ واقعہ ذرا دلچسپ تھا۔ اس لیے تخیلات کو بے لگام دوڑانے کا کافی موقع ملا اور ملک صاحب نے زور تخیل کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے محمد تغلق کی راجا کھیلہ پر فوج کشی کے نتیجے میں خاندان چیتور کی رانیوں کے جوہر کرنے کے اور راجا اور سردار سب کے کٹ مرنے کے واقعے کو بھی اسی سلسلے میں شامل کر دیا۔ ورنہ سلطان مالوہ کے ہاتھوں رانا سانگا اور رتن سین نے بارہا شکستیں کھائیں لیکن کوئی رانا کبھی اُن کے ہاتھوں اتنا تنگ نہیں ہوا۔ کہ رانیوں کے جوہر کی نوبت آتی ہو اور تمام سردار، ٹھاکر، کنور اور رانا کٹ مرے ہوں۔

مندرجہ بالا وجوہ پر محققانہ نظر ڈالنے کے بعد یہ بات صاف نظر آئے گی کہ مثنوی پدماوت کا پورا ڈھانچہ ملک صاحب کے زمانے کے واقعات پر قائم کیا گیا ہے۔ یعنی کچھ حصہ تو رائے سین کے راجا سہمی کے واقعات سے لیا گیا ہے۔ کچھ شیر شاہ کے قلعہ رہتاس کو فتح کرنے کے حال سے، کچھ غیاث الدین خلجی کی پدمنی کی تلاش سے کچھ شیر شاہ کے زمانے کے مشہور حالات و واقعات سے کچھ محمد تغلق کے راجا کھیلہ پر فوج کشی سے، اس کے علاوہ اس نظم کی تکمیل میں تخیل کو کچھ کم دخل نہیں دیا گیا۔ چنانچہ مثنوی کے آخر میں ملک صاحب نے خود ہی نظم کو فرضی قصہ قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ "کہانی جوڑ سناوا"

اسی سلسلے میں ایک دوسری جگہ فرمایا ہو کہ قصہ کہانی کہنا ایسا ہی ہو جیسے دہی میں اسے متھ متھ کر مکھن نکالنا ورنہ کہاں کی رانی اور کہاں کا راجا یعنی کہاں رانی پدمنی اور کہاں علاؤ الدین کا اُس کے حُسن پر فریفتہ ہو کر چتور پر حملہ کرنا۔

غالباً انھیں وجہ اور قراین کی بنا پر شمس العلماء مولوی ذکار اللہ خاں نے بھی اپنی مبسوط تواریخ ہندستان میں اس قصے کا خلاصہ دے کر کہا ہو کہ اس کی شان تاریخی واقعے کی نہیں افسانہ معلوم ہوتا ہو۔
مؤلف تاریخ ترکستان ہند (فارسی) نے بھی اس قصے کو نقل کر کے اعتراض کیا ہو کہ "علاء الدین جیسے سلطان ذی شان کی شان سے یہ امر بعید معلوم ہوتا ہو کہ اُس نے غیر کی زوجہ پر اپنی نیت بد کی ہو غیر کی زوجہ پر نظر اٹھانا علاء الدین کے قانون کے خلاف تھا۔ وہ ایسے لوگوں کا جو دوسروں کی بیویوں کو تاکیں سخت دشمن تھا۔ ایسا دشمن کہ زانی کو اس نے حقی کر دینے کا حکم دے دیا تھا اور چونکہ علاء الدین ایسے بادشاہوں میں نہ تھا جو رعایا کو تو ارتکاب جرم سے منع کریں اور خود اس فعل کے مرتکب ہوں اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ علاء الدین

لے اس ضمن میں بیانہ کے قاضی مغیث الدین سے علاء الدین کی گفتگو سننے کے قابل ہو ملاحظہ ہو۔

"ماہم چو تو نیز مسلمانیم و مسلمان زادہ ایم۔ ایں کہ سیاستہائے عظیمہ رسام ملک آرام لئی گیرد مردم براہ مستقیم نمی آیند۔ چوں فساد و فجار در زنا عریض اند بز جود ضرب و قید و حبس ممنوع نہ شوند بواسطہ عبرت باآں کہ نامشروع است، زانی را حقی می کنم و از آنکہ قصد و نیت من رفاہیت خلق اللہ است امید دارم کہ حق سبحانہ و تعالیٰ گناہم بہ بخشد و در توبہ نیز کثاہ است"

(منقول از تاریخ فیروز شاہی)

نے اپنے لیے زنا کو جائز کر رکھا تھا۔ اس کی تایید یوں بھی ہوتی ہے کہ جب کو تو ال علام الملک کے مشورے سے نصیحت پزیر ہو کر اُس نے خلق اللہ کو ترک شراب کا حکم دیا تو بقول (فرشتہ) بادشاہ نے اول اپنا عیش خانہ یعنی مجلس شراب بالکل برطرف کر دی۔ اپنے نفیس نفیس شرابوں کے ٹم کے ٹم دروازے کے آگے لُٹھوا دیے اور مکتی کے آلات و ظروف طلا و نقرہ سب گلا کر ان کے رُپی، اشرفیاں ڈھال لیں۔ اس کے علاوہ علام الدین کا عہد ایسی مثالوں سے بھی خالی نہیں کہ غیر کی حسین و جمیل منکوحہ جنگ کے قیدیوں میں اس کے ہاتھ آئی ہوں اور اس کے قبضے میں یہاں تک پہنچ چکی ہوں کہ حرم سلطانی میں موجود ہو لیکن سلطان نے باوجود رغبت زبردستی نہ کی ہو تاں کہ اُس نے مذہب اسلام قبول کر کے سلطان سے شرعی تعلق منظور نہ کر لیا ہو۔

پروفیسر حبیب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے بھی امیر خسرو کی تاریخ علائی یعنی خزائن الفتوح کے انگریزی ترجمے میں فتح چٹور کے حالات کے تحت میں فرشتہ کا لکھا ہوا قصہ ہندی فارسی سے نقل کر کے

۱۔ ایک حسینہ گجرات کے راجا کرن کی مشہور و معروف رانی کنولا دیوی تھی جو گجرات کی فتح کے سلسلے میں دیگر تحایف و اموال غنیمت کے ساتھ سلطان کے حضور میں مبرد بار پیش کی گئی۔ سلطان نے یہ معلوم کرنے ہی کہ راجا کرن کی زوجہ ہے اس کو فوراً محل میں لے جانے کا اور باعزاز تمام رکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ معہ اپنی اماؤں کے محل میں پہنچا دی گئی۔ شرعاً جنگ کی قیدی عورتیں کینز ہونے کی حیثیت سے جائز ہیں۔ سلطان چاہتا تو اُس کو روز اول ہی کینز بنا کر ڈال لیتا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔

۲۔ راجا کے قید سے بھاگ جانے اور گرد و نواح چتور کو تاخت و تاراج کرنے اور علارالدین کو عاجز کر دینے کا ذکر کیا ہے۔ گو اس کی تائید میں کرنل ٹاڈ نے بھی فرمائی ہے۔ لیکن خود علارالدین کے زمانے کے برتنی جیسے واقعہ نگاروں کے چشم دید بیانات اور ان کتبوں سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے جن سے ۱۶-۱۵ء تک چتور میں اسلامی حکومت کے استحکام کا پتہ چلتا ہے۔ بہر حال فرشتہ کا بیان کئی اعتبار سے مجروح ہونے کی بنا پر ناقابل اعتبار ہے۔ ایک اور بات بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے یعنی یہ کہ سلطان علارالدین کے پدمنی کے حاصل کرنے کے لیے چتور پر چڑھائی کرنے اور رانی کے خاندانی آن پر اپنی جان دے دینے کا ذکر فرشتہ نے بھی نہیں کیا۔

بہ مشکل ٹھہر سکتا ہے۔

اس اجمالی گفتگو سے اس قدر توضیح ہو گیا کہ مثنوی پر ماوت از سترپا ملک صاحب کے تخیلات کی رہین منت ہو گئے ہاتھ مورخین مابعد نے جو کچھ اس افسانے کے متعلق لکھا ہے اُسے بھی پرکھ لیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ملک صاحب کے تخیلات پر جو حاشیے لگائے گئے ہیں اور جن سے افسانے کو تاریخ بنایا گیا ہے۔ اُن میں اور ملک صاحب کے بیان میں کس قدر فرق ہے۔ اور ملک صاحب کی خوشہ چینیوں نے نقش ثانی کو نقش اول کے قدر بلند یا پست کھینچا ہے۔

چونکہ ملک صاحب کے عین مابعد کے مورخین میں اس افسانے کی تفصیل کرنل ٹاڈ اور ابوالفضل ہی کے یہاں ملتی ہے اس لیے ہماری تنقید کلیتاً انہیں دو بیانون تک محدود ہوگی۔ فرشتے کے متعلق پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ اُس کا بیان نہ قابل اعتبار ہے اور نہ مفصل اس لیے اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

کرنل ٹاڈ نے اپنی تصنیف ”تاریخ و روایات راجستھان“ میں چتور کے حملے کا ذکر اس طرح کیا ہے — ۱۱ وکرم سب ۱۳۳۱ء میں لکھی سی چتور کی گدی پر بیٹھا۔ لکھی سی کی کم سنی کی وجہ سے اُس کا چچا بھیم سی

سے ڈاکٹر ایٹوری پرشاد اپنی تصنیف ”تاریخ ہندو قرون وسطیٰ“ (MEDIEVAL INDIA)

کی دوسری اشاعت ۱۹۲۵ء مطبوعہ انڈین پریس کے صفحہ ۱۹۶ پر حاشیے میں رقمطراز ہیں کہ ٹاڈ نے بھیم سی غلط لکھا ہے ران کا نام رتن سین تھا۔ نین سی نے اپنی کہانی (KHAYATA) میں رتن سنگھ لکھا ہے اور یہی ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے فرشتے نے بھی رتن سنگھ لکھا ہے۔ حالانکہ صحیح نام نہ بھیم سی ہے نہ رتن سنگھ

اُس کے دلی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بھیم سی کی شادی سنہل کے چوہان خاندان میں راجا ہمیر کی لڑکی پد منی سے ہوئی تھی، جو حُسن و جمال میں آپ اپنی نظیر تھی۔ پد منی کے حُسن کا چرچا سن کر علماء الدین نے چتور پر فوج کشی کی اور لڑائی چھڑ گئی۔ دُوران جنگ میں بادشاہ نے کہلوا بھیجا کہ اگر مجھے پدماوتی کے درشن ہو جائیں تو میں دلی پلٹ جاؤں۔ اس پر یہ لڑی ہو کہ علماء الدین پد منی کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ اس قرارداد کے بعد لڑائی ختم ہو گئی اور علماء الدین پد منی کی صورت دیکھنے کے لیے قلعے میں گیا۔ قلعے سے پلٹتے وقت راجا بھیم سی بادشاہ پر اعتما دکر کے آخری پھاٹک تک پہنچانے آیا تھا کہ علماء الدین کے سپاہیوں نے جو پہلے ہی سے گھات میں لگے ہوئے تھے، راجا کو قید کر کے شاہی خیموں میں نظر بند کر دیا، اور اس طرح بھیم سنگھ کو اپنے قبضے میں کر کے اس کی رہائی کو پد منی کے حصول پر منحصر کیا۔ راجا کے قید ہو جانے کی خبر سن کر سارے چتور میں ایک تلاطم برپا ہو گیا اور پد منی نے اپنے میکے کے دو نامور سرداروں یعنی گورا اور بادل سے طلب اعانت کی۔ گورا پد منی کا چچا ہوتا تھا اور بادل اس کا چچا زاد بھائی اور گورا کا بھتیجا تھا۔ ان دونوں کی رائے کے مطابق علماء الدین کے پاس پیام بھیجا گیا کہ پد منی آئے گی مگر رانیوں کی طرح، اس لیے تمام شاہی فوج ہٹا دی جائے اور پردے کا پورا پورا انتظام کر دیا جائے۔ اور یہ بھی کہلوا دیا کہ پد منی کے ہمراہ بہت سی کنیزیں بھی ہوں گی اور اُس کی سہیلیاں بھی اُسے رخصت کرنے کے لیے ساتھ جائیں گی چنانچہ سات سو پالکیاں علماء الدین کے خیمے کی طرف چلیں ہر ایک پالکی میں ایک ایک راجپوت بیٹھا تھا۔

ہر پالکی اٹھانے والے چھو کہا رتھے۔ جو دراصل سپاہی تھے۔ یہ پالکیاں جب نیچے کے قریب پہنچیں تو قناتیں گھیر دی گئیں تاکہ اندر سواریاں اُتار دی جائیں۔ شاہی محل میں داخل ہونے سے پہلے پدمنی کو اپنے شوہر سے ملنے کے لیے صرف آدھ گھنٹے کی مہلت دی گئی۔ بھیم سی کے لیے ایک تیز گھوڑا پہلے سے تیار تھا۔ وہ اس پر سوار ہو کر اُسی وقفے میں جو اسے اپنی بیوی سے ملنے کے لیے دیا گیا تھا، گورا بادل اور کچھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ چتور گرٹھ کے اندر پہنچ گیا۔ باقی راجپوت بھی ساتھ ہی ساتھ پالکیوں سے کود پڑے اور انھوں نے دیر تک شاہی فوج کو تعاقب سے باز رکھا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب مارے گئے۔ پھر کیا تھا، جب کوئی روک ہی نہ رہی تو شاہی فوج قلعے کے پھاٹک تک پہنچ گئی۔

پھاٹک پر خوب لڑائی ہوئی اور راجپوتوں نے گورا اور بادل کی سرکردگی میں خوب خوب داد شجاعت دی۔ یہاں تک کہ شاہی لشکر ہزیمت پا کر دلی پلٹا۔ راجپوتوں کو اس لڑائی میں فتح تو ضرور ہوئی۔ لیکن چتور نے چیدہ بہادر سب قتل ہو گئے، ان میں گورا بھی تھا۔ بادل کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی۔ مگر وہ بڑی دلیری سے لڑا اور صحیح و سلامت واپس بھی آیا۔ اپنے شوہر کے بہادری سے جان دینے کا حال سن کر گورا کی بیوی سستی ہو گئی اس شکست کے بعد سب ۱۳۳۶ (مطابق ۱۲۸۵ء) میں علاء الدین نے چتور پر پھر

فوج کشی کی۔ اس لڑائی میں رانا کے گیارہ فرزند کام آئے وہ خود بھی مارا گیا اور رانی پدمنی بھی سستی ہو گئی۔“

ٹاڈ کا یہ بیان راجپوت تذکرہ نویسوں کے مطابق ہے اور دو ایک مقاموں کے علاوہ اُس تفصیل سے بھی ملتا جلتا ہے جو ابوالفضل نے چتور کے حملے کے سلسلے میں آئین اکبری میں دی ہے۔

آئین اکبری میں بھیم سی کے بجائے رانا کا نام رتن سی (رتن سنگھ یا رتن سین) لکھا ہے اور رانا کے مارے جانے کا ذکر بھی ابوالفضل نے دوسرے عنوان سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”جب دوسری لڑائی میں بھی علاء الدین ناکامیاب رہا تو اُس نے صلح کا پیغام بھیج کر رتن سی کو ملنے کے لیے بلایا۔ علاء الدین کے بار بار چڑھائیوں سے رتن سی تنگ آچکا تھا۔ اسی وجہ سے جب صلح کا پیغام ملا تو ملاقات کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ غرض ایک شخص کو وہ ساتھ لے کر علاء الدین سے ملنے کے لیے گیا۔ وہاں اُس کے ساتھی نے دھوکا دیا اور رانا

علاء الدین نے حملہ اول ہی میں چتور فتح کر لیا تھا۔ جیسا کہ حضرت امیر خسرو کی اس بیت سے ظاہر ہوتا ہے جو نسخہ چتور ہی کے متعلق آپ کی مثنوی دولرانی و خضر خاں میں مندرج ہے۔

بدولت کرد زان پس عزم چتور خرابی داد آں ہم را بہ یک دور

”بہ یک دور“ سے ظاہر ہے کہ قلعہ چتور ایک ہی یورش میں لے لیا

گیا تھا۔ کوئی دوسری لشکر کشی ۱۳۱۲ھ تک بلکہ اُس کے بعد بھی نہیں

ہوئی۔ ورنہ خزائن الفتوح یا تاریخ فیروز شاہی میں اس کا ذکر

ضرور ہوتا۔

مارڈ الا گیا۔ مس کے قتل کے بعد آرسی تخت نشین ہوا۔ بادشاہ نے چٹور کی بے سروامانی سے فائدہ اٹھایا اور قلعے پر حملہ کر دیا۔ آرسی مارا گیا اور پدمنی سب عورتوں کے ساتھ سستی ہو گئی۔ ان دونوں بیانون کو پیش نظر رکھ کر اس قصے کی اضافی حقیقت سے قطع نظر کے نظم پدماوت کو ملاحظہ فرمائیے تو ملک صاحب کے بیان میں کئی جگہ اختلاف ملے گا۔ مثلاً یہ کہ شاعر جاسی نے ٹاڈ کی تاریخ کے خلاف بجائے بھیم سی کے رتن سبن لکھا ہو، ملک صاحب نے لکھا ہو رتن سبن سنہل نیر کے راجا دیو پال کے ہاتھ سے مارا گیا۔ حالانکہ ان بیانات میں یہ ہو کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوا یہ دوسرا سوال ہو کہ لڑائی میں مارا گیا، یا دھوکے میں پدماوت میں شرط صلح یہ لکھی ہو کہ سمندر کی لڑکی لکشمی کے دیے ہوئے تحفے علامہ الدین کو ملیں۔ حالانکہ دوسرے بیانون میں بھی عکس دیکھنے کی شرط لکھی گئی ہو۔ ملک محمد نے بھی بادشاہ کو پدماوتی کا عکس آئینے میں دکھلایا ہو لیکن شرط صلح کی بنا پر نہیں بلکہ محض حسن اتفاق سے، راگھو کا ذکر بھی ملک محمد ہی کے زور تخیل کا نتیجہ ہو۔ بعد کے تذکروں میں اس کا کہیں بھی پتہ نہیں۔ رانا کو بجائے اس کے کہ شاہی خیموں میں قید کرتے ملک صاحب نے دلی میں نظر بند کیا ہو۔

یہ ہیں وہ باتیں جو ابوالفضل اور ٹاڈ کے بیانات کے خلاف ملک صاحب کی نظم میں پائی جاتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہو کہ آیا ان اختلافات کو پیدا کر کے ملک محمد جاسی سے اخذ کرنے والے بزرگوں نے اس افسانے کو بلند کیا ہو یا پست۔

جہاں تک رانا کے نام کا تعلق ہو۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہو

گو عہد علامہ الدین میں دراصل کوئی رانا اس نام کا چتور میں نہ تھا لیکن چونکہ ملک محمد جاسی کے بیان کی بنا پر عام مورخ متفق ہیں کہ دہلی چتور کا نام رتن سین یا رتن سنگھ تھا۔ ایسی صورت میں ٹاڈ کی شہادت محض اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ٹاڈ نے راجا کے نام کے بارے میں ملک محمد جاسی سے اخذ نہیں کیا۔ اور اس تقلید نہ کرنے کی وجہ سے ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے جیسا کہ عرض کیا جا چکا اس کا بتایا ہوا نام غلط ٹھہرا دیا اور ملک صاحب کے بتاتے ہوئے نام کو صحیح قرار دیا رہ گئیں اور باتیں، سو اُنھیں بھی کیے بعد دیگرے جانچ لیجیے ملک صاحب نے محض ضمنی طور پر پیدماوتی کے عکس کو آئینے میں دکھا کر جس بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے وہ غالباً اُن کے متبعین کے پیش نظر نہ رہ سکی۔ تبھی تو اُنھوں نے عزت اور آبرو کے تمام خیالات کو فراموش کر کے پیدماوتی کے چہرے کو آئینے میں راجا کی رضا مندی سے دکھائے جانے کا افسانہ جوڑ دیا۔ حالانکہ اس قسم کا اضافہ بجائے موزین کے ملک صاحب کے لیے زیادہ موزوں ہوتا کہ اُس اضافے سے اُن کی کہانی زیادہ دلچسپ ہو جاتی۔ لیکن ملک صاحب کی انسانیت اور غیرت یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ داستان کی روح رواں یعنی رتن سین کی کسی انسانی یا اخلاقی کمزوری کو دکھا کر اُسے دنیا کے سامنے صُبح کریں۔ یہی وجہ تھی کہ اس خیالی تصویر کشی میں اُنھوں نے اپنے ممدوح کا کچھ بھی ذکر لاتے وقت کافی احتیاط برتی ہے۔ مثلاً۔ رتن سین کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ ایک نامحرم اُس کی رانی کا چہرہ دیکھے، خواہ وہ آئینے ہی میں کیوں نہ ہو،

ملک صاحب نے اپنے ممدوح کے لیے گوارا نہ کیا اور اُس کو بچانے کے لیے اُنھوں نے سمندر کی لکشتی کے دیے ہوئے پانچ تحایف کا ذکر اپنے زور تخیل کی بنا پر کر دیا اور اسی کو صلح کی شرط قرار دیا۔ حالانکہ غیاث الدین خلجی کا آئینے میں رانی کا مُنہ دیکھنے والا قصہ اُن کے پیش نظر تھا جسے اُسی طرح کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا تھا جیسے بعد کے مورخین نے اُسے استعمال کیا لیکن ملک صاحب نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس ٹکڑے کو اس حسین انداز سے پیش کیا کہ نہ پدمنی کو غیرت پر آئینے کی آبرورہی کی آبرورہی۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے یعنی اپنے ممدوح کے اخلاق اور وقار میں فرق نہ لانے کی غرض سے ملک صاحب نے نظم میں ایک فرضی شخص راگھو کا اضافہ کر دیا جس کے بغیر ملک صاحب پدماوت کا عکس علاء الدین کو دکھانے کے تھے۔ راگھو گھر کا بھیدی تھا وہی بتا سکتا تھا کہ وہ تمام عورتیں جو بادشاہ کو دیکھنے کے اشتیاق میں متجسّسہ انداز میں جمع ہوئی تھیں ان میں پدماوتی نہیں ہے اور بادشاہ اُسی سے پوچھ بھی سکتا تھا۔ چتور کے کسی دوسرے آدمی سے بادشاہ یہ سوال اخلاقاً نہ کر سکتا تھا کہ اُن عورتوں میں پدمنی کون سی ہے۔

ملک صاحب نے رتن سین کا محبس بجائے خیمے کے دلی قرار دے کر ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ راجا کو دلی پہنچا دینے کے بعد اُنھیں موقع ملا کہ وہ رانیوں کے رنج و غم کا خاکہ کھینچیں۔ قاصدوں اور جاسوسوں کو چتور روانہ کریں۔ پدمنی کے پاس دیوپال کا پیغام پہنچائیں۔ اور گورا بادل کی بہادری کو دل کھول کر

بیان کریں۔ گو اس سے ملک محمد کا مطلب رتن سین کی رانیوں کی محبت اور بادل کی کم سنی اور دلیری کی نمائش بھی تھی۔ لیکن اصل غرض ان کی یہ تھی کہ وہ دیو پاں کو پیش کر سکیں تاکہ رتن سین کو چتور واپس لانے کے بعد قبل اس کے کہ شاہی لشکر چتور پہنچے اُسے دیو پاں کے مقابلے کے لیے بھیج کر رانا کی غیرت اور حمیت کا ثبوت بھی دیں اور اُس کو شاہی فوج کے ہاتھوں مارے جانے کی ذلت سے بھی بچا سکیں۔

غرض ملک صاحب نے ہر جگہ نظم کے حُسن و قبح کا لحاظ کرتے ہوئے افسانوں میں واقعات کا رنگ بھرا ہے۔ کہیں نظم میں حُسن پیدا کرنے کے لیے کہیں مخصوص افراد نظم کی سیرت کو بلند کرنے اور اُن کے وقار کو قائم رکھنے کی غرض سے اور کہیں درس اخلاق دینے کے لیے اور یہ سب اُنھوں نے اس انداز سے کیا ہے کہ سارا افسانہ واقعہ معلوم ہونے لگا۔

ع۔ عالم ہمہ افسانہ مادارد و ماہیج

البتہ جیسا کہ ظاہر ہوا ملک صاحب کے خوشہ چیں اس افسانے کو تاریخ کے صفحات پر جگہ دیتے وقت نقش ثانی نقش اول سے بہتر نہ بنا سکے۔

شاعر جالسی کا نظریہ محبت | محبت کے مختلف عنوان ہوتے ہیں مثلاً زن و شو کی محبت جو عموماً

تعلقات قائم ہونے سے شروع ہوتی ہے اور بعد میں اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ عورت اپنے مرد کے لیے ہر قسم کی زحماتیں

اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتی ہو اور یہی حال اکثر مرد کا بھی ہوتا ہو۔ عورت کے نزدیک مرد اُس کی دنیا ہوتی ہو اور مرد کے لیے عورت سکون کا باعث۔ اس قسم کی محبت کی مثال رام اور سیتا ہیں۔ رام کی جلا وطنی کے زمانے میں سیتا جی کا اُن کے ساتھ جنگل کی مصیبتیں سہنا۔ پھر راون کے سیتا کو ہرے جانے کے بعد ایک طرف سیتا کا پریشان رہنا اور دوسری طرف رام کا سرگردان پھر نازن و شو کی محبت کا بہترین نمونہ ہو — یا ایسی محبت جو بہ یک نظر پیدا ہو جائے مثلاً شکنتلا اور دشینت کی محبت کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دل دے بیٹھتے ہیں — یا وہ بواہو سانہ جذبہ جسے سطحی نظر سے دیکھنے والے محبت کا نام دے دیتے ہیں لیکن جس کا انجام چارون کی چاندنی اور پھر اندھیرا پاکھ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا — یا وہ محبت جس کے لیے کہا گیا ہو کہ ”بسا کین دولت از گفتار خیزد“ پدماوت میں اسی محبت کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ رتن سین توڑنے کے منہ سے پدماوتی کی تعریف سنتا ہو فریفتہ ہو جاتا ہو اور جوگی بن کر اس کی تلاش شروع کر دیتا ہو۔ اس قسم کی محبت گو فارسی عشق کے مطابق ہو جہاں فرہاد شیریں کے لیے پہاڑ کھود ڈاتا ہو یا محنوں لیلیٰ کے لیے دشت دشت مارا پھرتا ہو مگر ہندی طریقہ عشق کے خلاف ہو جہاں عورت مرد سے عشق کرتی ہو اور اس کی جدائی میں پریشان رہتی ہو۔ شاعر جاسی نے جہاں اس رواج سے علیحدگی اختیار کی ہو وہاں پدماوتی کو بھی اتنا ہی بے قرار دکھا کر ہندی طریق محبت کا نمونہ بھی پیش کر دیا ہو اور اس طرح فارسی

اور ہندی محبت کے دو متضاد نمونوں کو ایک ہی مقام پر اکٹھا کر دیا ہے۔ پدمنی کی محبت اور عشق کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ رتن سین کے سولی پر لٹکا دینے کا حکم سن کر وہ بال بکھرانے اور منہ پر دھول ڈالنے لگی یا بعد میں اُس سے جدا ہو کر دیوانہ وار پھرنے لگی۔ رتن سین پہلی مرتبہ اس محبت کی دیوی کو دیکھ کر جب غش ہوا ہے اُس وقت جو الفاظ پدما دتی کے منہ سے نکلے ہیں وہ اس کی حقیقی محبت کے شاہد ہیں اور ہندی طریق عشق کے گواہ۔ وہ کہتی ہے۔

”جوگی تو نے بھیک حاصل کرنے کے لائق جوگ نہیں سیکھا
جب بھیک کا پھل حاصل کرنے کا وقت آیا تو سو گیا“ محبت میں
فراق اور وصال کی جو تصویریں پیش آتی ہیں اس کا خاکہ بھی
ملک صاحب نے خوب کھینچا ہے۔

فراق جس عنوان سے شاعر جالسی نے فراق کا ذکر کیا ہے اُس میں مبالغہ آمیزی کے باوجود سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ اُن کا مبالغہ بات کا بتنگڑ نہیں معلوم ہوتا اور اس میں ایسی تڑپ ہے جو ہمسایوں کو بے چین کر دے اور پھولوں کو خاک سیاہ اور پانی کو آگ بنا دے۔ البتہ شاعر کے درد کا باطنی پہلو جتنا روشن ہے اتنا ظاہری پہلو نہیں ہے درد کے ظاہری پہلو کی مثالیں بھی اُن کے کلام میں ہیں مثلاً راجا کے درد محبت کا ذکر اُنھوں نے یوں کیا ہے۔

آکھر جرنہ نہ کا ہو چھوا تب دُکھ دیکھ چلاے سوا

ترجمہ۔ حرف اس طرح جلتے تھے کہ کوئی خط کو چھو نہ سکتا تھا یہ دیکھ کر

تو تاجیلا یا۔ یا ناگمتی کی حالت فراق کا تذکرہ ان لفظوں میں موجود ہے۔
 جبہ پنکھی کے نیر ہو کہے برہ کے بات سوئی پنکھی جائے جرتوڑو ہی نہات
 ترجمہ۔ جس پرند کے نزدیک ہو کر ہجر کا حال کہتی ہوں۔ پرندہ اور
 درخت دونوں جل جاتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا۔ مگر یہ اُن کا امتیاز
 نہیں ہے۔ اُن کی خصوصیت تو باطنی پہلو کا اظہار ہے۔ چنانچہ انھوں
 نے یہ کم کہا ہے کہ جدائی کا درد اتنا قوی ہے لیکن یہ زیادہ کہا ہے کہ
 درد فراق ایسا موثر ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

لاگیوں جڑے، جڑے جس بھارو پھر پھر بھونچس تجیون نہ بارو
 ترجمہ۔ میں تمہاری لگن میں ایسی جلی ہوں جیسے بھاڑ میں دانہ —
 کہ بار بار جلتا اور بھٹتا ہے مگر بالو کو نہیں چھوڑتا۔ فراق نے
 رہ رہ کر مجھے جلایا لیکن میں نے تجھے نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔

یہاں محبت کی مقدار نہیں بتائی گئی نہ اس کی ناپ کا کوئی
 پیمانہ بتایا گیا ہے نہ وہ محبت جس کا ذکر ملک صاحب نے کیا ہے وہ
 ایسی ہے جسے ناپا جائے یہ محبت تو دل ہی میں پیدا ہوتی ہے وہی
 رہتی ہے وہی بڑھتی ہے اور وہی رہ کر عاشق کو نیست و نابود
 کر دیتی ہے — شاعر جاسی نے جدائی کا ذکر جس عنوان سے
 کیا ہے اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی محبت باطنی ہے

ۛ جہی پںکھی کے نییر ہوہ، کھہ بیرھ کے بات ۛ

سوہ پںکھی جای اہر، تہیر ہوہ نیپات ۛ

ۛ

لاگیون جڑے جڑے جس مارو ۛ

فیر فیر بھونچس تہیر نہ بارو ۛ (پدماہت)

نہ کہ ظاہری۔

چنانچہ ”پریم یوگی“ رتن سین کی رخصت کے وقت جس طرح انسانی دل دو نیم ہیں اُسی طرح چاند، جنگل کے پیڑ، جانور، پمندا، پتھر بھی افسردہ دل نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جب ناگمتی کی آنکھ سے فراق کے آنسو گرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا مغموم ہے۔ ناگمتی کا درد فراق ہندی ادب کا ایک نایاب گوہر ہے۔ ناگمتی پیڑوں کے نیچے رات بھر روتی پھرتی ہے اور پرند اور پیڑ غرض جو بھی اس حالت غم میں اُس کے سامنے آتا ہے اُسے وہ اپنا دُکھڑاساتی ہے اور سننے والوں کی خاموشی سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اثر لے کر داستان الم سُن رہے ہیں۔

کیا کہنا محبت کی اس منزل کا جہاں غیر اپنے معلوم ہونے لگیں اور بیگانوں میں یگانگت پائی جائے۔ دوسرے شاعروں نے پرندوں سے مخاطب کرنے کے بعد اُن سے کوئی مدد نہیں لی مگر شاعر جاسی نے اُن کے دلوں میں بھی انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ رام کے پرند جواب نہیں دیتے لیکن جب ناگمتی جنگل سے

لے لہک لہک جس کوئل روئی رکت آنسو گنگلی بن بوئی

ترجمہ۔ کہک کہک کے کوئل کی طرح روئی اور اشک خونیں نے گنگلی سے جھٹل بھر دیا۔

کڑھکی کڑھکی جس کوئل روئی رکت آنسو غوغا بن بوئی ॥

لے لہک لہک روئی کوئی نہ ڈولا آدمی رات بہنگم بولا۔

ترجمہ۔ بار بار روئی لیکن کوئی نہ لٹکا آدمی رات کو بہنگم بولا۔

فیر فیر روئے کوئل نہی بولا ۱ آدھی رات بیہنگم بولا ۱۱

روتی پھرتی ہو تو آدھی رات کو بہنگم پرند بولتا ہو اور پوچھتا ہو کہ کس سبب سے رات بھر آنکھ نہیں لگاتی یہی نہیں بلکہ حالات معلوم کرنے کے بعد پیام لے جانے پر بھی تیار ہو جاتا ہو۔

فراق کا جتنا بھی ذکر پدماوت میں ملتا ہو اس کا بہترین حصہ ناگمتی کا بارہ ماسہ ہو جس کا ترجمہ آخر کتاب میں شامل ہو اس میں مختلف قسم کے تاثرات فراق ملتے ہیں آدمی کے لگائے ہوئے پھول پھل پودے کس طرح اُس کے غم اور خوشی میں شریک رہتے ہیں اس کا ذکر بھی بارہ ماسے میں موجود ہو۔

چنانچہ جدائی کے زلمے میں ناگمتی کا سارا باغ سوکھ جاتا ہو۔ اُس میں کوئی دل کشی باقی نہیں رہتی لیکن رتن کشین کے چتور واپس آتے ہی سرسبز و شاداب ہو جاتا ہو۔

فراق کا تذکرہ کرتے وقت ملک صاحب نے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا کہ فراق میں دُکھ اور سکھ دونوں تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ بلکہ اچھی چیزیں غم کو اور بڑھادیتی ہیں۔ جدائی کا مرض ایسا نہیں ہو تا کہ گرد و پیش کی خوشنما چیزوں سے دل پہلے اُن سے تو غم میں اور بھی اضافہ ہوتا ہو۔ ناگمتی دکھتی ہو

لے کبھ دُکھین نہ لاؤس آنکھی

ترجمہ۔ کس کے درد سے رات بھر آنکھ نہیں لگاتی۔

केहि दुख रैनि न जाविस आँखी (पद्मावत)

पलटी बागमती कैबारी ।

सोने फूल फूलि फुलबारी ॥

کہ سب کے پچھڑے ملتے ہیں مگر اُس کا پیارا نہیں پٹا تو کس حسرت سے کہتی ہو کہ ”کنت نہ پھرے بدلیسا بھوے“ یعنی شوہر نہ پٹا پر دیں میں بھول گیا۔ اسی غم فراق میں وہ یہ بھی بھول جاتی ہو کہ پدماتی ہی اُس کی پریشانی کا باعث ہو۔ اس کو بہنگم پرند کے ہاتھ یہ پیغام کہلا بھیجتی ہو۔

موہ بھوگ سوں کا ج نہ باری سوئھ دشت کے چاہن ہاری
ترجمہ۔ مجھے عیش و عشرت کی خواہش نہیں ہیں تو فقط دید کی
خواہاں ہوں۔

جدائی کے عالم میں ناگمتی تمام خود داریوں کو بھول جاتی ہو اور پرندوں اور چرندوں کو بھی نہایت عجز کے ساتھ مخاطب کرتی ہو۔ ”بھونرا“ اور ”بے کاگ“ کا انداز مخاطب داد سے بے نیاز ہو۔

غرض جاسی نے جدائی کا جو خاکہ پیش کیا ہو وہ بہت مؤثر ہو اور چونکہ ناگمتی کی داستان فراق بیان کرنے میں ملک محمد جاسی نے ہندی مذاق اور ادب کا بہت لحاظ رکھا ہو اور فارسی ادب کی جھلک کم آسکی ہو اس لیے داستان اور بھی مؤثر ہو گئی ہو۔

ذکر فراق کی طرح پدمات میں تذکرہ وصال بھی آیا ہو

وصال | اور ناگمتی کی دلدوز آہوں کے بعد ہی ہم کو نغموں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

मोहि भोग सौं काज न बारी ।

ۛ

सौड़िं विस्ति कै चाहन हारी ॥

(पद्मावत)

غم کی فطری پایداری اور پھر اس پر ناگہمی کی کوک ایسی نہیں کہ انسان اس غم کے اثر کو فوراً کسی دل خوش کُن داستان کے سنتے ہی فراموش کر دے البتہ اضمحلال اس کا متقاضی ضرور ہوتا ہو کہ اب یہ آہیں نہ سُنائی دیں تو اچھا ہے۔ چنانچہ ملک محمد جاکسی نے اس ضرورت کو ملحوظ رکھا اور ایسا کر کے اُنھوں نے نظم میں چار چاند لگا دیے ہیں اس بر محل مقابلے نے وصال کے لطف اور فراق کے غم دونوں کو بڑھا دیا ہے۔ شادی کے بعد رتن سین اور پدماوتی کے وصال کا ذکر پدماوتی میں اتنے ہی تفصیل کے ساتھ جتنی وضاحت کے ساتھ ناگہمی کے فراق کا ذکر کیا گیا ہے۔ پدمنی کا سنگار کر کے رتن سین کے پاس آنا اس حصّہ نظم کا ایک خاص اور دل فریب جزو ہے جس میں محاکات کا کافی زور موجود ہے۔

وصل کی شب پہلے تو کچھ اور باتیں ہوتی ہیں اُن کے بعد راجا اُن مشکلات کا تذکرہ چھیڑتا ہے جو اُسے راہ میں پیش آئی تھیں۔ غالباً پدماوتی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے۔

لیکن راجا کی ساری کہانی سننے کے قبل ہی بجائے ہمدردی کے وہ اظہار نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں رانی اور تو جوگی میرا تیرا کیا ساتھ۔

مگر ان بے اعتنائیوں کے باوجود بھی رتن سین اپنا قصّہ الاپتا ہی جاتا ہے اور دردِ اُلفت کے اظہار میں مصروف رہتا ہے یہاں تک کہ پدمنی رتن سین کی محبت کا اندازہ کر کے اس کی جانفشانیوں کی داد دیتی ہے اور اُسے سر لہنے لگتی ہے۔

یہی وہ منزل معرفت ہو جہاں پہلے خدا ہمیں اچھا معلوم ہوتا ہو اور بعد کو ہم بھی خدا کو اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ پہلے رتن سین کو پد منی سے محبت ہوتی ہو بعد میں پد منی بھی محبت کرنے لگتی ہو۔ اس سلسلے میں شاعر جانشی نے جسمانی لطف اندوزی کا جو خال خال ذکر کیا ہو اس میں بھی محبت کی مٹھاس کو قائم رکھا ہو جس کی وجہ سے یہ تذکرہ مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتا۔ ملاحظہ ہو ایک جگہ فرماتے ہیں۔

گر بجے گنگن چونک کنٹھ لائے

ترجمہ۔ جب بادل گر جتا ہو تو چونک کر شوہر کے گلے لگ جاتی ہو۔
ناگمتی کو جو بوندیں فراق میں تیر سی لگتی ہیں پد منی کو وہی بوندیں لطف دیتی ہیں۔ فراق اور وصال میں اتنا فرق۔

پداوت کا مرتبہ ہندی ادب میں | پداوت اپنی ٹھیٹھ زبان، بے عیب طرز ادا، ترتیب و

تسلل، سادہ سیرت اور وصف نگاری کے اعتبار سے ہندی ادب میں ایک نمایاں درجے پر فائز ہو اور ہندی زبان کی پریم کہا نیوں میں

سہ ہندی زبان میں جو پریم کہانیاں لکھی گئی ہیں اُن کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ ”بیر گا تھا“ ۲۔ ”پریم گا تھا“ ۳۔ ”جیون گا تھا“

پرتھوی راج راسو مرگاوتی۔ اندراوتی رام چرت بانس

مصنفہ چتر اوتی پداوت مصنفہ مصنفہ

چند بردائی نور محمد عثمان، قطبن، ملک محمد تلسی داس

(علی الترتیب)

پدماوت سر بلند نظر آتی ہے۔ مرگاہوتی، اندراوتی، چتراوتی وغیرہ کو لوگ کم جانتے ہیں لیکن پدماوت ہندی ادب کا جگمگاتا موتی ہے۔ بلاغت اور دیگر محاسن شاعری کے لحاظ سے بھی پدماوت کا شمار اونچے درجے کی تصانیف میں کیا جاتا ہے۔ ٹھیکہ اودھی زبان کا علم حاصل کرنے والوں کے لیے ایک بے بہا گوسر ہے۔ یہ ایک وسیع نظم ہے۔ ایک شاعرانہ نظم ہے۔ یہ ایک تاریخی نظم ہے۔ ایک صوفیانہ نظم ہے۔ ایک اخلاقی نظم ہے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ اردو اور ہندی کے درمیان ایک رشتہ ہے کتنا نازک اور پھر بھی کتنا قوی۔ اردو کے ارتقا کی تاریخ کا دیباچہ ہے کتنا حسین اور سیر حاصل دیباچہ۔ آج سے تین چار سو برس قبل کے تمدن اور معاشرت کا آئینہ ہے۔ کتنا روشن آئینہ۔ حکمت و موعظت کا دفتر ہے۔ جذبات و احساسات کا خزانہ اور مفید معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ۔ جب تک ایک بھی ہندی داں موجود ہے پدماوت کا نام باقی رہے گا اور جب تک حسن و وفا اور ایثار کا شمار بلند ترین انسانی صفات میں ہوگا۔ اس وقت تک پدماوت ایسی نعمت سمجھی جاوے گی جس کی قیمت کا اندازہ مشکل سے لگایا جاسکے گا۔

پدماوت پر ایک سرسری نظر | احسن ترتیب۔ ترتیب کے اعتبار سے پدماوت کو ہم تین

۱۔ پدماوت کی مقبولیت کا شاید کچھ اندازہ اس سے ہو سکے کہ تصنیف ہونے کے سو ہی سال کے اندر اس کی شہرت ارکان ایسے دور دراز مقام تک پہنچ گئی تھی اور علماء و فقہاء تک اس کی قدر کرتے تھے۔

حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پدماوتی کی پیدائش سے رتن سین کے محاصرہ سنہل گڑھ تک ابتدا۔ شادی سے لے کر سنہل دیپ سے رخصت ہونے تک وسط اور راگھوچیتن کی جلا وطنی یا چتور واپس آنے سے پدمنی کے سستی ہونے پر خاتمہ۔ بیچ بیچ میں جو ضمنی تذکرے جملہائے معترضہ کے طور پر آگئے ہیں وہ اصل قصے کو دبائے اور اس پر جھانوں ڈالنے کے بجائے اُس میں تسلسل پیدا کرتے ہیں اور اُسے خاص انداز سے آگے بڑھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہیرامن کی خریداری کا ذکر راگھوچیتن کا حال ۲ بادل کا تذکرہ یا دیو پال کی کٹنی کا منصہ شہود پر لانا۔ ان ٹکڑوں میں آپس کا ایک خاص لگاؤ پایا جاتا ہے اور یہ حصے نظم سے غیر متعلق اور غیر ضروری نہیں معلوم ہوتے۔ یہی حال ناگتی کے بارہ ماسے کا ہے۔ اگر ان میں سے ایک کو بھی نظم سے علیحدہ کر لیا جائے تو نظم ایک قالب بے جان بن کر رہ جائے نہ نظم میں دل کشی باقی رہے نہ تسلسل۔ البتہ کہیں کہیں ایسے اذکار بھی آگئے ہیں جو نظم کے موضوع اور مقصد کے اعتبار سے فی الحقیقت غیر ضروری اور غیر متعلق ہیں۔ اور پدماوت ایسی شاہکار کے شایان نہیں۔ مثلاً گھوڑوں کے اقسام، پھل پھولوں کے نام، سولہ سنگار، جوتش اور علم نجوم کی بھرمار یا پدماوتی کے منہ سے ”تو رنگ نہ رانچے جو لگ ہوئے نہ چون“ (بغیر چونے کے رنگ نہیں چڑھتا) نکل جانے پر پالوں کی فشموں کو گنونا یا محض ضمناً پان کا ذکر آ جانے پر پان کی خصوصیات کا شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا۔

لیکن باوجود اس عیب کے شاعر نے نہ اصل موضوع سے علیحدگی اختیار کی ہے نہ اس سے تسلسل میں کسی قسم کا فرق آنے دیا ہے۔

سیرت نگاری | سیرت نگاری ایک مشکل فن ہے ملک محمد جانی نے بھی اس فن کی مشق کی ہے لیکن وہ انسانی

فطرت کے الجھاؤ میں نہیں پڑے انھوں نے ہر فرد کو تصوف کی ایک نہ ایک اصطلاح کا مترادف قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے اپنے افراد نظم کی محض ایک خصوصیت کو نمایاں کیا ہے۔ کسی کی بہادری کا ذکر کیا ہے تو کسی کی محبت کا کسی کی وفا کو معرض تحریر میں لائے ہیں تو کسی کی دغا کو غالباً یہی وجہ ہے کہ ملک صاحب کے یہاں سیرت نگاری کے جو مرتعے ملتے ہیں وہ سادے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے شاعر نے نہ اپنے اصول موضوع سے علیحدگی اختیار کی ہے نہ تسلسل میں کسی قسم کا فرق آنے دیا ہے۔

پدماوتی | پدماوتی نظم کی روح رواں ہے۔ ابتداءً نظم سے آخر تک کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر کتاب میں موجود ہے۔

خود نظم کا نام بھی اسی کے نام پر پدماوت رکھا گیا ہے۔ دراصل نظم کی تمام خوبیاں اُسی کی ذات کی رہیں منت ہیں۔ اُس کی سیرت میں ایک خاص قسم کی متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ چپٹور آنے سے قبل وہ صرف ایک سچی محبت کرنے والی عورت کے لباس میں نظر آتی ہے رتن سین کو خوش پاتی ہے تو خود بھی شاداں نظر آتی ہے جب وہ غمگین ہوتا ہے تو یہ بھی خاک بستر ہو جاتی ہے۔ رتن سین کو سولی کا حکم ہوتا ہے تو پدماوتی بھی جان پر کھیلنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

اُس کی رہائی ہوتی ہے تو یہ بھی خنداں دکھائی دیتی ہے۔ شوہر سستی پدمادتی کی سیرت کی جان ہے اور اس کے کردار کا کوئی گوشہ اس صفت سے حالی نہ ملے گا۔

پدمادتی محبت کا ایک بے مثل مجسمہ اور فراست کا ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ شاعر جاسی نے اس کی سیرت کو فراست کا مترادف قرار دیا ہے۔ لیکن دراصل اس کے خاص جوہر محبت اور وفاداری بشرط استواری ہیں اور اہل دل کے نزدیک یہی ”عین ایمان“ ہے۔

رتن سین | ملک محمد جاسی نے رتن سین کو روح قرار دیا ہے اور چتور کو جسم۔ دراصل رتن سین نظم کی جان ہے۔ اور راجپوتوں کی ہنگامہ آرائی کے ساتھ اُس کو وہی نسبت ہے جو جان کو جسم کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی میں چتور آباد اور خوش حال ہو اور جب وہ نہیں تو چتور سونا معلوم ہوتا ہے۔ ادھر رتن سین مارا گیا ادھر چتور قالب بے جان کی طرح بے حس نظر آنے لگا۔ پدمادتی کے بعد اگر کوئی فرد نظم پر حادی معلوم ہوتا ہے تو وہ ذات رتن سین کی ہے۔ رتن سین کی پیشانی سے جواہر کی سی روشنی ظاہر تھی۔ اور بادشاہوں کی شان و شوکت اُس میں موجود تھی۔ سیر و شکار کا شوق، عجائبات عالم کا مطالعہ کرنے اور حتی المقدور ان کو فراہم کرنے اور جمع کرنے کا ذوق یہ سب اُس میں موجود تھا اور اسی ذوق سلیم کا نتیجہ تھا کہ ہیرامن کے نطق گو یاتی نے رتن سین کو گر ویدہ کر لیا۔ رتن سین کی محبت پاک تھی اور اُس کا عشق سچا لیکن باوجود حد درجہ محبت کرنے کے وہ خوددار بھی ہے۔ چنانچہ سہاگ کی رات کو جب

پہنی راجہ کا امتحان لیا چاہتی ہو تو وہ کہتا ہو کہ
 ”ہون دن پر جھکی تم چھا نھاں“
 ترجمہ { میں سورج ہوں اور تم اُس کا عکس۔

رتن سین کا علاؤ الدین کو قلعے میں بلانے کے سلسلے میں اپنے
 دو معتمد سپاہیوں یعنی گورا اور بادل کی ناراضگی کا خیال نہ کرنا اس کی
 سادہ لوحی پر دال ہو۔ لیکن ایک محبت صادق ہونے کے اعتبار
 سے ہم اس بارے میں اُس کو معذور سمجھ کر معاف کر سکتے ہیں۔
 راہ عشق میں اُس کی پامردی اس کی کمزوریوں کی پردہ پوش ہو۔
 غالباً چٹور اور خلق اللہ کو تباہی سے بچانے کے لیے اس نے ایسا کیا۔

ناگمتی | ناگمتی کو شاعر جانیسی نے دنیا کا دھندا کہا ہو۔ اور جو سیرت
 اُس کی نظم میں پیش کی گئی ہو وہ بھی ایسی ہو جیسی ایک
 دنیا دار کی ہوتی ہو۔ عورت ہونے کی حیثیت سے اُس میں اور پدماوتی
 میں اکثر باتیں مشترک ہیں وہ بھی اپنے سرتاج کی جدائی میں افسردہ
 اور اُس کے قید ہو جانے کی وجہ سے پریشان ہوتی ہو اور غالباً اتنی
 ہی جتنی کہ پدماوتی لیکن قید سے رہا کرنے کی تدبیر پدماوتی ہی سوچتی
 ہو۔ پدماوتی کا عشق عقل کے ساتھ جلوے دکھاتا ہو اور ناگمتی کا عشق
 اندھا ہو۔

اولاً ناگمتی ایک بر خود غلط عورت کی صورت میں نظر آتی ہو
 جس کو اپنے حسن نیم روز پر پابندگی کا گمان ہو اور جس کی خود پسندی
 اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ وہ تو تے تک سے ملا کی طالب تھی۔ اللہ لے
 حسن دل فریب کی ابلہ فریباں !!

لیکن یہ تمام خود آرائی اور خود پسندی رتن سین کی چاہت تک موقوف ہے۔ ادھر رتن سین کی نظر پھری اُدھر ساری خود نمائی اور سنگار غایب ہو جاتا ہے۔ رتن سین کے جوگی بن کر جنگل کی راہ لینے پر ناگمتی کی برہا کوک جو بارہ ماسے کی شکل میں پدماوت میں موجود ہے یا رتن سین کے قید ہو جانے پر ناگمتی کی پریشان حالی ناگمتی کی محبت کا اُسی طرح پتہ دیتی ہے جس طرح رتن سین کی دالپسی پر اس کا پھولانہ سمانا — ناگمتی کی سیرت ہندی عورتوں کی پایدار اور بے لوث محبت کا ایک کمیاب نمونہ ہے۔

رتن سین اور بادل کی مائیں | یہ افراد نظم بظاہر تودو ہیں لیکن بحیثیت ماں کے ان دونوں میں اولاد کی محبت اور ماں کی مامتا مشترک ہیں۔ رتن سین کی ماں اُس کے سنہل گڑھ کا رخ کرتے وقت بے حال نظر آتی ہے اور بادل کی ماں باوجود اس کے کہ تلواروں کی چھانٹوں میں پئی ہے بادل کو میدان جنگ کی طرف جانے سے روکتی ہے۔ بچوں کی جُلائی دونوں کو شاق ہے۔

بادل کی بیوی | یہ سیرت تمام نظم میں سب سے زیادہ مؤثر اور دل گداز ہے بادل کی بیوی ابھی ابھی بیاہ کر آئی ہے چنانچہ اُس میں شوہر کو میدان جنگ سے باز رکھنے کا فطری جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن اس کی سیرت میں ایک چھتری ہوشمند عورت کی نمایاں خصوصیات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ اپنے شوہر کے میدان سے مُنہ موڑنے کو تمام قوم اور قبیلے کے لیے باعث ننگ

سمجھ کر وہ خود بادل کو جنگ کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ اور اس طرح جوش دلاتی ہے۔

جو تم کنت جو جھ جیو کا ندھا تم کئے ساہس میں ست بانڈھا
رن سنگرام جو جھ جت آؤ لاج ہوئے جو پیٹھ دکھاؤ

ترجمہ { یعنی اسی پیارے شوہر تم لڑائی کا ارادہ رکھتے ہو اور میں سستی ہونے کا، ان دونوں باتوں کا جب دونوں طرف سے نباہ ہو گا تب ہی ہم پھر مل سکیں گے۔ اگر تم لڑائی میں مارے گئے اور میں سستی نہ ہوئی یا تم پیٹھ دکھا کر بھاگ آئے تو ان صورتوں میں ہم میں ملاقات نہ ہوگی۔ دونوں نے اپنے اپنے ارادوں کو پورا کیا تو ضرور ساتھ ہو گا جیت کر آئے تو دنیا میں اور مارے گئے تو آخرت میں۔

راگھو | یہ ایک پست فطرت فرد ہے جس میں لالچ ملک فروشی، بے حیائی اور ہوس کو شئی کے نقوش اُبھرے ہوئے ملتے ہیں۔

راگھو فی الواقع جیسا کہ ملک محمد جانیسی نے لکھا ہے شیطان ہی تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے راگھو چیتن کی ضد ہیں اور

گورا اور بادل | دنیا سے شجاعت کے دو امنوں موتی، ملک دلیری اور خوش فکری کے دو درخشاں ستارے اور محبت وطن سے ایسے سرشار کہ کسی قسم کا بُرے سے بُرا برتاؤ بھی ان کو ملک فروشی کے لیے آمادہ نہ کر سکتا تھا۔ ملک کی حفاظت کے مقابلے میں ان کو کوئی

जो तुम कैंत बूझ जिउ कौंधा,

तुम किब साहस में तल बौंका ।

रह संजाम बूझि जिति आबहु,

साज होइ जो पीठि बेसाबहु ॥

(पद्मावत)

چیز عزیز نہ تھی۔ شرافت کو ان سے شرف حاصل تھا اور وفاداری کو ان پر ناز۔

علامہ الدین | یہ فردِ نظم اپنے ارادوں میں استقلال کا اظہار کرتا ہو اور ایک ایسے سپاہی کے لباس میں دکھایا گیا ہو جس کو غرورِ دولت اور ہوس کو شنی نے اندھا کر دیا ہو۔

وصف نگاری | پداوت میں وصف نگاری کی اکثر مثالیں شادی کے تذکرے اور سنہیل دیب کے سفر اور دیگر مقامات پر ملتی ہیں لیکن شاعر جاسی کی وصف نگاری کو کامیاب وصف نگاری نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ ملک محمد جاسی نے محض چیزوں کے نام گنوا دیے ہیں اور یہ کسی طرح بھی وصف نگاری کی تعریف میں نہیں آتا مثلاً سنہیل دیب کا جو تذکرہ اُنھوں نے کیا ہو اُس میں محض نام گنوا دیے ہیں اور یہ کہ دیا ہو کہ وہاں جانا گویا ”کیلا س“ جانا ہو لیکن اس کے سوا ان کے بیان میں کچھ نہیں ہو۔ نہ تو شیرینی روح پائی جاتی ہو اور نہ کوئی رولق۔

بازار میں زرو جواہر کی دکانیں لگی ہوئی ہیں۔ ترازو کی ڈنڈیاں چاندی کی ہیں۔ سوداگر بھی دکان پر بیٹھا ہوا ہو۔ لیکن پھر بھی بازار میں سناٹا ہو۔ نہ بکری ہو رہی ہو نہ خریدار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ دکان دار اذگھ رہا ہو اور خریدار سو گئے ہیں۔ ٹھگ، چور، اُچکے، گرہ کٹ سبھی اس بازار میں موجود ہیں مگر ہم ایک کو بھی نہیں پہچانتے نہ ملک صاحب ان کا کوئی حلیہ بتاتے ہیں۔ طوائفیں بھی بہ ہزار حشوہ و ناز موجود ہیں مگر ان کی موجودگی بھی بازار میں کوئی

خصوصیت نہیں پیدا کرتی۔ اُن کے ہوتے ہوئے بھی سرفروش کہیں نظر نہیں آتے۔

اس قسم کی وصف نگاری سرور کی واقعہ نگاری سے متی جُلتی ہے جو بے کیفیت ہوتی ہے۔ نہ کہ سرشار کے انداز بیان سے جس میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

رسم و رواج | ہندستان کی عورتوں کے مشاغل سیر و تفریح اور اُن کی آزادی پر کب سے پہرے بٹھا دیے گئے اور دنیا کی اکثر آسائشیں اُن کے لیے کب سے ممنوع قرار دے دی گئیں۔ اس کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے۔ البتہ ہندستان کے تمدن اور معاشرت پر نظر ڈال کر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہاں عورتوں کو کافی آزادی تھی۔ میلے اور اس قسم کے اکثر اجتماعی موقعے عورتوں کے آپس میں ملنے جلنے اور مبادلہ خیالات کے لیے خاص طور پر وقف تھے اور اب بھی اس معاشرت کے رہے سہے جلوے کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔

بنت، ہولی، دیوالی کے تہوار ہندی عورتوں ہی کی بدولت آج بھی کیسے پُر رونق اور دل فریب ہوتے ہیں۔ ساون میں جھوے کی پینگیں برسات کی دلچسپیوں میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہیں۔ چنانچہ ملک صاحب کے زمانے میں ان مواقع کے علاوہ عورتوں کے آپس میں ربط و ضبط کا ایک اور مظاہرہ ”جل کھیڑا“ تھا۔ یعنی عورتیں گروہ درگروہ نہانے کو جاتی تھیں اور اس سلسلے میں تالابوں اور دریاؤں پر جلے جمایا کرتی تھیں۔ پداموت میں اس رواج کا تذکرہ پدمنی کے غسل کے سلسلے میں اس طرح کیا گیا ہے کہ محاکات اور واقعہ نگاری کی خوبیوں کے

علاوہ اوصاف شاعری اور محاسن زبان بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔
 پدماوت کا سہیلیوں کی جھرمٹ میں غسل کے لیے جانا، تالاب
 کے نزدیک پہنچنا، ساریاں جُن کر رکھ دینا اور پھر تالاب کے اندر
 داخل ہو کر بال کھول دینا اور مستانہ وار کھیلنا، ان سب باتوں کا
 ذکر، تشبیہ اور استعاروں کی جن حسن افزا نزاکتوں کے ساتھ کیا گیا ہے
 وہ تعریف سے مستغنی ہے۔

فنی خصوصیات | فنی اعتبار سے بھی پدماوت ایک گرانمایہ تصنیف
 ہے۔ شگفتہ استعارے عام اور مقامی تشبیہات،
 مناظر قدرت کی مصوری، درد غم کی دل گداز تصویریں، حسن و عشق کی
 نیزنگیاں غرض اکثر فنی خصوصیات پدماوت میں پائی جاتی ہیں۔ چند
 مثالیں ملاحظہ ہوں۔

تشبیہ | پدماوتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ تالاب میں غسل کر رہی ہے
 اس منظر کی کیسی حسین تصویر کھینچی گئی ہے۔

۱۔ سرور تنہہ سماءے سنسارا چاند نہائے پیٹھ ے تارا
 ترجمہ { تالاب میں ایک عالم سما یا ہوا ہے۔ چاند ستاروں سمیت نہا رہا ہے۔
 ۲۔ جس آنچل منہہ چھپے نہ دیا تس انجیار دکھاوے ہسیا
 ترجمہ { جس طرح آنچل میں چراغ کی روشنی نہیں چھپتی اُسی طرح دل کا

सरवर मंह समाव संसारा

चान्द नहावपीठ ल तारा

जस लौयल मंह छिपै न दिषा

तस सन्जयार दिखावै क्षिप

نورِ صنوفِ کن رہتا ہے۔

۳۔ ناسک کیر، کنول مکھ سوہا پدمن روپ دیکھ جگ موہا
ترجمہ { توتے کی سی ناک اور کنول کا سا زیبا منہ، پدمنی کی صورت
دیکھ کر عالم فریفتہ ہوا۔ سمندر کا پانی گرم ہو کر موجیں مار رہا ہے اس کی تشبیہ
مکمل دی ہو ملاحظہ ہو:-

۴۔ تلچھ تیل کراہ جم ام تلچھ سب نیہ

ترجمہ { جس طرح کڑاہ میں تیل جوش مارتا ہے اسی طرح پانی اُبل رہا ہے۔
رتن سین پدماوتی کی سہیلیوں سے کچھ کلام کرتا ہے اس پر وہ سب کی
سب ہنستی ہیں۔ اُس کی تشبیہ یوں دی ہے:-
۵۔ جانورین تران پرگسی

ترجمہ { گویا رات میں ستارے نمودار ہوئے۔

حُسنِ تعلیل | توتے کی گردن میں سُرخ و سیاہ حلقہ ہوتا ہے شاعر جاسی
اس کی علت یہ بتاتے ہیں کہ نامہ ہجر جو اس کے گلے
میں باندھ دیا گیا تھا اُسی کی تپش سے نشان پڑ گئے۔ ملاحظہ ہو:-

۱۔ راتے سیام، کنٹھ جرلا گے

ترجمہ { سُرخ و سیاہ کنٹھ جلنے کی وجہ سے پڑ گیا تھا۔

ناسک کیر کھل मुख. سوہا

पदमन रूप देख जग गोहा

तलफै तलफै कराह जिम इम तेल सच नीर ६

जानी रोग तरायन परगसी ७

राखे स्याम कंठ जर लागे ! ८

چاند اخیر ماہ میں دودن غایب ہو جاتا ہے اور پھر جب دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ شروع ہوتی ہے تو وہ سیاہی مایل ہو جاتا ہے اس کی وجہ وہ پدماوت کے حُسن کو دیکھ کر شرمندہ ہو جانا بتاتے ہیں (غالب نے بھی اسی طرح کی علت اپنے اس قصیدے میں بتائی ہے جس کا مطلع ہے "ہاں مہ نوسین ہم اس کا نام" شاعر جاسی فرماتے ہیں۔
۲۔ اتنی روپ مورت پر گئی گھٹ گھٹ چندر اماوس بھتی ترجمہ { ایسی حسین عورت ظاہر ہوئی کہ چودھویں رات کا چاند چھوٹا (خفیف) ہو کر گھٹ گیا۔ گھٹتے گھٹتے اماوس ہوا اور شرم کی وجہ سے دو دن زمین میں گڑا رہا پھر جب دوج کے دن نکلا تو سیاہ فام نکلا۔ یہ سیاہی اسی کے چہرے پر رشک کی ہے۔

پدماوتی کی مانگ کو شاعر جاسی نے کرن سے تشبیہ دی ہے
مبالغہ پھر غالب اس تشبیہ کو کم وقعت سمجھ کر فرماتے ہیں۔ سورج کی روشنی کم اور اس کی زیادہ۔

۱۔ جانو سورج کرن ہست کاڑھی سورج کلا گھاٹ وہ باڑھی غالب نے بھی خوب کہا ہے۔

حُسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشیدِ جمال اچھا ہے

हसी रूप मूर्ति पसाइ ।

बट बटफलमावस भई ॥

जानो सूरज किरन हित कादी

सूरज कला बाट वह बादी

۱۵

۱۶

تخیل اور روانی | تخیل اور روانی شاعری کی جان ہیں جس نظم میں ان میں سے ایک بھی موجود ہو کافی بلند سمجھی جاسکتی

ہے۔ چہ جائیکہ وہ نظم جس میں یہ دونوں اوصاف موجود ہیں جیسا کہ پرمات میں ہے روانی تو اس درجہ ہے کہ اکثر ابیات منظوم رد مرہ معلوم ہوتی ہیں۔

الف) روانی۔ کسی سے ملاقات کے لیے اگر چتور جائیں تو کہیں گے کہ تم کو چتور میں سن کر میں نے کہا کہ ملاقات کروں۔ بالکل اسی طرح ملک محمد جانی نے نظم میں کہا ہے۔

۱۔ سن تم کہنے چتور نہ کہیں کہ بھینٹوں جاے

اسی روانی کے ساتھ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

بل جیو نہ رہا تن سو جاگا

ترجمہ { جان میں دم نہ رہا (مگر) جسم میں تو زور ہے۔

غائب نے بھی اسی مضمون کو دوسرے انداز سے کہا ہے۔

کو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

جاتے نہ میٹا تا کہ کہا

ترجمہ { اُس کا کہا مل نہیں سکتا۔

सुनि तुम कहें चितौर मैं,

कहिँ कि भेटों आप

له

बल जिये न रहा तन सो आगा ।

له

आब न भेटा ताकर कहा ।

له

ایک بار بھر دیو پیالہ بار بار کو مانگ
 ترجمہ { ایک ہی بار پیالہ بھر دو بار بار کون مانگے۔
 مانی جاسی نے اس مضمون کو ذرا بند کر کے یوں پیش کیا ہے۔
 اندازہ تر کیا ہے وہ کیا جانیے کیا دے
 لکھ ظرف تمنا یو نہی اس در پہ صدا دے
 رواں کے لمحات آخر کی بے کسی کس بے ساختگی کے ساتھ بیان کی ہے۔
 ۵۔ نانی پوت کوٹ دس اہا روون ہار نہ اکیو رہا
 ترجمہ { وہ رادن جس کے دس کروڑ پوتے اور نو اسے تھے اُس کا
 رونے والا کوئی نہ تھا۔
 آرژو لکھنوی نے بھی اسی مضمون کو کہا ہے۔
 قتال جہاں معشوق جو تھے سونے میں پڑے مرقد اُن کے
 پامرنے والے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں
 ۶۔ رکت کے بوند کیا جب آہیں پدماوت پدماوت کاہیں
 ترجمہ { جب تک جسم میں لہو کی ایک بوند بھی ہے اس وقت تک پدماوت
 پدماوت رٹے جاؤں گا۔
 فارسی میں خسرو دہلوی کا ایک شعر بہت مشہور ہے جس کا ایک
 مصرع "من تو شدم تو من شدئی زباں زد عام ہے۔ اسی مضمون کو

۱۵
 एक बार भर देवपियाला, बारबार कोमांगु

नाली फल कीटि दस अहा । रोवनहार न एको रहा ॥ १५

रक्त के बूँद किया जब आही । १६

पदमावत पदमावत काही

شاعر جاسی نے بھی باندھا ہے۔

۷۔ جیو کاڑھ لین تہہ آئیں وہ بھاکیا جیو تم بھین
ترجمہ { جان نکال کر تم چھپ گئیں وہ جسم ہو گیا اور تم جان
۸۔ برہ کال مارے پر مارے

ترجمہ { ہجر ضرب پر ضرب لگاتا ہے۔ مرے کو مارتا ہے۔ معشوق کی طلب
پر سر کے بل جانے کو کس انداز کے ساتھ نظم کیا ہے ملاحظہ ہو:-

۹۔ جو بلاوے پاسوں ہم تہاں چلیں بلاٹ

ترجمہ { جو وہ پاؤں کے بل بلاوے تو ہم سر کے بل جاتیں۔

مکتوب نصف ملاقات کا حکم رکھتا ہے اسی کو شاعر جاسی نے بھی
نظم کیا ہے۔

۱۰۔ آدھی بھینٹ پر تیم پاتی

۱۱۔ آہنہ گرو اور آہنہ چیلآ آہنہ سب او آپ اکیلا

ترجمہ { آپ ہی پیر اور آپ ہی مرید آپ ہی سب کچھ اور آپ
ہی اکیلا۔

جب پچھڑا ملتا ہے تو اس سے محبت زیادہ ہوتی ہے اسی مضمون

जिय काढ़ लीनतै अड़ीं - बह भा किया जीब तुम भई

विरह काल मारे पर मारे

जो बुलावे पासों हम तहां चले लिलाट ।

आधी गेंद प्रीतम पाती

کو یوں نظم کیا ہے۔

۱۲۔ ادھک موہ جوٹے بھجوتی

۱۳۔ جیو لیت پونچھنا کالو

ترجمہ { موت دن میں پوچھتی اور انتظار نہیں کرتی ۔

ایک منظر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

اور نکمت چھوندس اجیارے بٹانوں بٹانوں دیب اس بائے
ترجمہ { اور ستارے چاروں طرف روشن تھے ۔ جگہ جگہ مثل چراغ کے
جل رہے تھے ۔

۱۵۔ ٹوٹے من نو موتی پھوٹے من دس کانچ

لینڈ سمیٹ سب آہن ہوئے گا دکھ کرناچ

ترجمہ { غم میں نو من موتی اور دس من کانچ چوڑ چوڑ کر دی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد سب نے ٹکڑوں کو سمیٹ لیا کو یا دکھ کرناچ

نہنم ہو گیا۔

(ب) تخیل ۔ یہ بتانا کہ یہ مثال روانی کی ہے اور اس میں خاص

تخیل ہی بہت دشوار ہے اس لیے کہ تخیل اور روانی کو بعض اوقات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۱ ۱۵۰۔ आपदिगुरु रुद्र आपदि चेला ।

आपदि सब अरु आप पकेला ॥

अधिक मोह लिविदीदी ।

जिब लत पूछ ना कालू ।

दूट मन नौ मोही, फूटे मन दस कांच ।

लौन समेट सब आभरनु होयगा दुख कर नांच ॥

۴۔ پریم پنہ دن گھڑی نہ دیکھا تب دیکھے جب ہوئے سرکھا
ترجمہ { محبت میں دن اور گھڑی نہیں دیکھتے جب عقل باقی ہو
تو اُس کا خیال رہے۔ زمانہ ہر شخص کو پس دیتا ہے اس خیال کو
شاعر جاسی نے استعارے کی مدد سے ادا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

دھرتی سرگ جانتے دوؤ یہ بچ جیور کھ بچانہ کو دوؤ
ترجمہ { زمین اور آسمان مثل چکی کے دو پاٹ کے ہیں جس نے اس میں
سر رکھا سلامت نہ بچا۔ بعد میں کبیر نے بھی اسی خیال کو نظم کیا ہے۔

محاکات | پداوتی تالاب میں غسل کر رہی ہے اس کی جو تصویر
شاعر جاسی نے پیش کی ہے اُس سے بہتر غالباً عکس
سے بھی نہیں اُتاری جاسکتی۔

سرور نیر پد منی آئی گھو پنا چھوڑ کیس پھیلائی
سس مکھ انگ ملیا کر باسا ناگن چھاپ لینہ چھو پاسا
ترجمہ { تالاب کے نزدیک پہنچ کر پد منی نے گھونگھٹ اٹھا کر
بال بکھرا دیے۔ چاند ایسے چہرے اور خوشبو سے بسے ہوئے بدن کو کالی
ناگنوں نے گھیر لیا۔

۱۔
پ্রেम पंच दिन बड़ा न देखा,
तब देखे जब होय सरेखा ॥

۲۔
घरती सरग जांत ले दोऊ । यह बिच जिव रख बचान कोऊ ॥

۳۔
अरपर निपर पदमनी आई वोंपा छोद केस पैसाई ।
सस मुख भंग सलपा कर बासा नागन छाप लीह चहू पास ।

محاورہ | پداوت میں اکثر محاورے استعمال ہوتے ہیں جن میں سے چند درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ کر بسنت پداوت گئی راجا تب بسنت سدھ بھئی
ترجمہ { جب بسنت کر کے پداوت چلی گئی تب راجہ کو بسنت کی خبر ہوئی۔
۲۔ جو پیست گھن جائے پیسا
ترجمہ { جو کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

مقولہ | شاعر جانیسی نے بعض بعض مقاموں پر مقولے نہایت خوبصورتی سے نظم فرمائے ہیں۔

۳۔ باور اندھ پریت کر لاگو سونہ دھنسنے نہیں سو بھے آگو
ترجمہ { جس کو محبت ہوتی ہو وہ دیوانہ اور اندھا ہو جاتا ہے۔ سامنے چلا جاتا ہے مگر سو جھتا نہیں۔

ضرب المثل | مثل محاوروں کے ضرب الامثال بھی پداوت میں موجود ہیں اور جس روانی کے ساتھ وہ نظم کیے گئے ہیں ان سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

۴۔ کچن برن سواات لونا مانو ملا سہاگن سونا
ترجمہ { سونے کے رنگ کا حسین تو تھا گویا سونے میں سہاگا ملا

۵۔ کے وسانت پدماوت गई। राजा तव वसंत सुधि मई

۶۔ औ पीसत चुन जाये पीसा।

۷۔ वाउर अंध प्रीत कर लागू।

८۔ सोन धसे तहिं सूके आग ॥

९۔ कंपन बरन सुआ अति कोना। माना मिला सुहागन सोना ॥

۲۔ سوا کا بول منو بکھ لاگا

ترجمہ { توتے کی بولی زہر لگی۔

۳۔ کاہ وہ پنکھ ٹوٹ منہ کوٹے اس بڑ بول چیت مکھ چھوٹے

ترجمہ { کیا وہ پرند جس کے منہ سے تلخ بات نکلے وہی مثل کہ چھوٹا منہ بڑی بات۔

۴۔ ماتھے نہیں بیارے جون سٹھ سوا سلون

کان ٹوٹیں جیہی پھر کالے کرب سولون

ترجمہ { سر نہ چڑھانا چاہیے چاہیے تو تا کتنا خوبصورت کیوں نہ ہو۔ کان ٹوٹیں جس زیور سے ایسا سونا کس کام کا۔

پداوت میں پند و نصائح اور حکمت کے بہت سے مسائل بیان ہوئے ہیں۔

حکمت و موعظت

بہت کیا پداوت شروع سے آخر تک تمام تر حکمت اور سرتا پا پند ہی ہے۔ لیکن انداز بیان و اعظانہ نہیں ہے بلکہ گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

ملک صاحب کا یہ انداز بیان بالکل اچھوتا ہے جو سحر کا حکم

سुआ का बोल मानो विप लतागा

काह वह पंख टूट मंह कोटे ।

अस बड़ बोस कित मुख छोटे ॥

माथे नहीं बिसारिये जों साठे सुआ सलोन ।

कान टूटे जेही पहर, काले कल सोसोन ॥

مثل مشہور ہے کہ بیٹ پرے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔

رکھتا ہے۔ ورنہ کجا مسائل تصوف اور کجا ان کی عام فہمی۔
آستانہ محبت کا احترام کرنے اور وہاں پر غصہ نہ کرنے کی تعلیم
ایسے الفاظ میں دی گئی ہے کہ انسان بغیر سبق لیے نہیں رہ سکتا۔
فرماتے ہیں:-

اپر یکم بار ہوئے کرود۔ نہ ہوؤ

ترجمہ { در دوست پر غصہ نہ کرنا چاہیے۔

سچ کی تعلیم کس عمدہ پیرائے میں اور کن کن انداز سے دی گئی ہے۔

۲۔ جہاں ست تہاں دھرم سنگھاتا

ترجمہ { جہاں سچ ہے وہیں ایمان بھی ہے۔

اس فلسفے کو ملک صاحب نے مختلف عنوان سے بیان فرمایا ہے۔

۳۔ پرکھ چاہئے اونچ ہیاؤ دن دن اونچے راگھے پاؤ

ترجمہ { انسان کو بلند حوصلہ ہونا چاہیے اس کو لازم ہے کہ روز بروز
بلندی پر قدم رکھے۔

۴۔ دن دن اونچا ہووے جنھ اونچے پر جاؤ

اونچ چڑھت جو کہن پڑے اونچ بچھاڑے کووڑ

۱۔ پریم وار ہوئے کروش نہ ہوؤ

۲۔ جہاں سত্য تہاں دھرم سنگھاتا

۳۔ پوروں چھوئے کھوئے دھیاؤ۔

۴۔ دین دین اُنچے راگھے پاؤ۔

۵۔ دین دین اُنچا ہووے جیہ اُنچے پر جاو

اُنچ چدات جیہ سس پڑے، اُنچ نہ چوڑے کوو۔

ترجمہ { جو شخص اونچے سے ملاقات رکھے دن دن ترقی کرے گا۔
اگر اونچے سے گرے بھی تب بھی بلندی کا خیال نہ چھوڑے

دل کا حال اور معشوق کی چاہ چھپائے سے نہیں چھپتی۔ راہِ عشق
کی مصیبتیں پتھر کو پانی کر دیتی ہیں ان دونوں مصیبتوں کا ذکر شاعر جاسی
نے کیا ہے۔

۵۔ دوی سو چھپائے نا چھپے ایک بیا اک پاپ

۶۔ پریم پننتھ من بھول نہ راجا کٹھن پریم سروئے تو چھا جا
ترجمہ { راہِ محبت کی کہانی سن کر ناراض نہ ہو۔ محبت کی راہ بہت
سخت ہے بغیر سروئے کچھ بن نہیں پڑتا۔

شوہر کی اطاعت ہندی عورت کا امتیاز ہے اور غالباً اس کی
اطاعت شعاری ہی اس کا سبب ہے کہ باوجود تمام تمدنی اور معاشری
پابندیوں کے ہندی عورت اکثر اپنے شوہر کے دل پر پورا پورا قابو
رکھتی ہے اسی کو ملک صاحب نے کہا ہے۔

۷۔ کنت سہاگ پائے سا دھا

پادے سوئی جو اوہی جت باندھا

ترجمہ { شوہر کے سہاگ کا مزہ وہ پاتا ہے جو اسی کا دھیان رکھے۔

دو سو छिपाये ना छिपे, एक दिया एक पाप

پ্রেम पंथ मन भूल न राजा ।

कठिन प्रेम सर दिये तो छाजा ॥

कंत सोहागा पाय साधा ।

पावे सोई जो बहिषित बाधा ॥

۸۔ لون بلون تہان کو کہے لون دہی کنت جے چہے
ترجمہ { حسین اور غیر حسین کا کیا سوال۔ جسے شوہر چاہے وہی حسین ہے۔
بقول مانی جاسی ع۔ "جس ذرے کو آغوش میں لے لے وہ حسین ہے۔"
۹۔ عاقبت نا اندیشی سے یہ کہہ کر باز رکھا ہے۔

دوش ماہ جیہ سو جہ نہ آگو
ترجمہ { جس کو آگے نہ سو جہے وہی قابل الزام ہے۔
ہنر کو نہ تو پوشیدہ رکھنا چاہیے اور نہ اُس کا اس طرح اظہار
کرنا چاہیے کہ خود ستائی معلوم ہونے لگے ان میں سے ایک اصول
کی تلقین ملک صاحب نے بھی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

۱۰۔ گن نہ چھپائے پردے ماہنا

ترجمہ { ہنر کو پوشیدہ نہ رکھنا چاہیے۔

جب قحط الرجال ہوتا ہے تو ناقص چیز بھی کامل ہو جاتی ہے۔

جیہ سرور ماہنس نہ آوا بگلا تہہ سرہنس کہا وا

ترجمہ { جس تالاب میں ہنس نہیں آتے وہاں بگلا ہی ہنس کہلاتا ہے۔

ان مثالوں سے انداز ہو گیا ہو گا کہ ملک صاحب نے پند و نصیحت

میں عمد کے پہلو کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ روزمرہ اور ان کی زبان کی

لون विलोन तहां को कहे ।

لون वही कंत जो चहे ॥

दोष तहि जेहि सूक्त न आगू ।

गुन न छिपाये परदे माहा ।

जेहि सरवर मंह हंस न आवा । वगला तेहि सर हंस कहावा ॥

انوکھی اور نرمالی شیرینی نے جس پر اُن کو پورا پورا تصرف حاصل تھا اس موضوع کی تلخی کو اور بھی کم کر دیا ہے اس پر ان کا خاص اور دلکش انداز بیان مستزاد ہے۔

اکھراوٹ | اکھراوٹ کبیر کی چونیٹی کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ الفاظ کا انتخاب، زبان کی روانی، بندش کی چستی پتہ دیتی ہے کہ یہ نظم شاعر جاسی کے دور آخر کا نتیجہ ہے۔ اس کے یہ بھی قرآن ہیں کہ اکھراوٹ پدماوت کے بعد کی تصنیف ہو لیکن سنہ متعین نہیں کیا جاسکتا۔

اکھراوٹ کا نمونہ کلام

۱۔ مہم محمد پریت پیارا تیں اکھریہ ارتھ بچارا
۲۔ سا۔ ساہس جاگر جگ پوری سو پاوا وہ امرت موری
ترجمہ { جو باہمت ہے وہ امرت پاتا ہے
۳۔ کھا۔ کھیلو کھیلو ادہ بیٹا بن کا کھیلو کھیل سمیٹا
ترجمہ { اُس کی معرفت حاصل کرنے والا کھیل کھیلو اور کیا کھیلتے ہو۔

۱۔ مہم محمد پریت پیارا

۲۔ سا۔ ساہس جاگر جگ پوری

۳۔ کھا۔ کھیلو کھیلو ادہ بیٹا

بن کا کھیلو کھیل سمیٹا

۴۔ کھا۔ کھیلو کھیلو ادہ بیٹا

بن کا کھیلو کھیل سمیٹا

۴۔ دے سب کچھ کرتا کچھ ناپیں جیسے چلے میگھ پر چھائیں

۵۔ کہوں سو گیان گکھرا سب آکھر منہ لیکھ

پنڈت پڑھ آکھراوی ٹوٹا جو رہو دیکھ

۶۔ جاسو کیا درپن کے دیکھو آب مانھ آپ

آکھ آپو جائے ملو جھن نہ بن نہ پاپ

آخری کلام | نام کے اعتبار سے تو اس کتاب کو ملک صاحب کی آخری تصنیف کہنا چاہیے لیکن اس کے مطالعے کے

بعد نظم میں بندش کی سستی اور زبان کا پھیکا پن دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ اس کتاب کے نام کو تصنیف کی مدت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بہر حال یہ نظم ابتدائے مشق کی ہو یا آخر زمانے کی ہر صورت میں پیداموت کے قبل ہی کی ہو اس لیے کہ پیداموت میں شیر شاہ کی

۱۔ وہ سب کھنکھرتا کھنکھرتا ناہی۔

۲۔ جسے چلے میپ پر کھنکھرتا۔

۳۔ کھنکھرتا سو جہان کھنکھرتا سب آکھرا مہ لے لے

پنڈت پڑھ آکھراوی ٹوٹا جو رہو دیکھ

۴۔ جاسو کھنکھرتا کے دیکھو آپ مہ آپ

آپو آپ جادھ ملو جھن نہ بن نہ پاپ (پیداموت)

۵۔ آخری کلام غالباً آخرت نامہ کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔ کتابت کی غلطی سے ایسا ممکن ہے۔

۶۔ پیداموت میں شیر شاہ کا ذکر یوں موجود ہے۔

پور شاہ دلی سلطان

پور شاہ دلی سلطان

مدح ہو اور آخری کلام میں بابر کی، اور پدماوت کا سنہ تصنیف ۹۳۶ھ/۱۵۲۵ء
 ہو اور آخری کلام ۹۳۶ھ/۱۵۲۵ء کی نظم ہو۔

اس میں مرنے کے بعد جو واقعات پیش آئیں گے وہ درج ہیں
 اور اس سلسلے میں حضرت محمد مصطفیٰ کے اہل بیت کے شفیع روزِ محشر
 ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہو۔

ملک صاحب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے اعتبار سے یہ
 کتاب ایک خاص اہمیت رکھتی ہو۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہو
 کہ محی الدین سے ملک محمد کا سلسلہ ارادت سید اشرف جہانگیر کے گھرانے
 سے ان کی عقیدت مندی کے بعد شروع ہوا۔

اس نظم میں ملک صاحب کا جائس کو "موراستھان" کے تعارفی
 فقرے کے ساتھ پیش کرنا اس گمان کو بھی قوی کرتا ہو کہ ملک صاحب
 نے آخری کلام کو اپنے وطن سے کہیں باہر تصنیف کیا تھا کیونکہ ۹۳۶ھ
 تک جو اس نظم کی تصنیف کا سنہ ہو سلطنت مغلیہ جائس تک نہ
 پھیلی تھی۔

ممکن ہو کہ ملک صاحب نے اس نظم کو دہلی کے قریب ہی لکھا ہو
 اور وہاں سے پلٹ کر جائس میں پدماوت کی طرح ڈالی ہو۔

لے آخری کلام میں ظہیر الدین بادشاہ کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہو:-

بابر شاہ چہترپست راجا راج پاٹ ان کا بدھ سا جا

لے جائسی گرنہا ولی کی جدید اشاعت میں آخری کلام بھی شامل کر دی

گئی ہو۔ اولاً یہ کتاب بھی فارسی رسم الخط میں تھی۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

اپنے پیر کی مدح فرماتے ہوئے کہا ہے:-

۱۔ جو چالیس دن سیوئے بار بہارے کوئے

درشن ہوئے محمدؐ پاپ جلتے سب دھوئے

ترجمہ { جو کوئی چالیس دن خدمت کرے اس کو درشن ملیں اور سب گناہ دھل جائیں۔

۲۔ یہ سنسار سَپَن کر لیکھا مانگت بدن نین بھر دیکھا

۳۔ کاموسون اُن جھگر پسارا حسن حسین کہو کو مارا

۴۔ پَن رِساے کے کہے گسائیں فاطمہ کا ڈھونڈو دینائیں

۵۔ پَن رسول کنہ آپس ہوئی فاطمہ کا سمجھاؤ سوئی

جौ चालिस दिन सेवै, बार बहारे कोइ

वरसन होइ "मुहम्मद" पाप जाय सब धोइ

यह संसार सपन कर लेखा

मांगत बदन नैन भरि देखा

का मोसौं उन ऋगर पसारा

हसन हुसैन कहौ को मारा

पुनि रिसाइ के कहै गोसाईं

फातिमा कहं दूँदहु दुनियाईं

पुनि रसूल कहं आयसु होई

फातिमा कहं समुझाबहु सोई

۶۔ جو بی بی چھاڑیں یہ دوکھو تو میں کروں اُمت کے موکھو
 بس اب ملک صاحب کی ایک تصنیف کا تذکرہ اور
پوستی نامہ رہ گیا۔ یعنی پوستی نامہ جس کے محض دو شعر دستیاب
 ہو سکے جو حاضر ہیں۔

جب پستی مان لاگیں پات پستی کو دے نو نو ہات
 ترجمہ { جب پوستے میں پتے لگے پوستہ نو نو ہات کو دے لگا۔
 جب پستی مان لاگیں پھول تب پوستی مٹکاوے کول
 ترجمہ { جب پوستے میں پھول لگے تب کو لٹھے مٹکانے لگا۔

متفرق اشعار شاعر جاسی کے چند متفرق اشعار اور بھی سننے
 میں آئے ہیں جن کو اسی سلسلے میں خاتمہ کلام
 کے طور پر بغیر کسی تہید و تنقید کے اہل نظر کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔
 ۱۔ نیا د نہ کیئہ کیئہ ٹھکرائی ان کیئہی لکھ دین بُرائی
 ترجمہ { انصاف نہ کیا بلکہ ٹھکرائی کی یعنی جو بُرائی ہم نے کی بھی نہ تھی
 اس کو بھی ہمارے نامہ اعمال میں پہلے ہی سے لکھ دیا یا یہ کہ جو بُرائیاں
 ہم نے کی بھی خفیہ انھیں "ان کیئہی" لکھ کر مجھے معاف کر دیا۔

لے
 जौ बीबी छांड़हूँ यह दोखू

तौ मैं करौँ उमत कै मोखू

(آخری کلام)

لے
 जब पुस्ती मां लागे पात । पुस्ती बूदे नौ नौ हात ॥

لے
 जब पुस्ती मां लागे फूल । तब पुस्ती मटकावे कूल ॥

(پوستی نامہ)

۲۔ ہمارے تو ایک محمد پیارا جیون مرن سہارن ہارا
ترجمہ { ہمارا تو بس ایک محمد پیارا ہو جو موت اور زندگی میں ہمارا
مددگار ہو۔

۳۔ برست نور ہی تمہارے دوارا کیسے نہ ہوے جگت اُجیارا
ترجمہ { (ای محمد) تمہارے دروازے سے نور برستا ہو تو پھر دنیا میں
کیسے روشنی نہ ہو۔

۴۔ نرمل بھان ہو دو جگ ما نہیں چاند سورج تمہری پر چھائیں
ترجمہ { تم (ای محمد) دونوں عالم میں روشن سورج ہو بلکہ چاند اور
سورج تمہارا عکس ہیں۔

۵۔ کون اس ٹھانوں جہاں پت ناہیں

پھوٹ نین ترے سو جھت ناہیں
ترجمہ { کون سی ایسی جگہ ہو جہاں محبوب نہیں (البتہ) انکھیں تیری پھوٹ
گئی ہیں (اس لیے) دکھائی نہیں پڑتا۔

۶۔ ہے کرتار! تو سب کچھ دیکھا ہم باور کچھ چیت نہ کینھا
ترجمہ { ای باری تعالیٰ تو نے ہم کو سب کچھ دیا لیکن ہم پاگوں نے
کچھ بھی دھیان نہ کیا۔

۷۔ تم ہو نور نور یزدانی تمہری صفت کو نہ نہیں جانی
ترجمہ { تم نور یزدانی ہو تمہاری صفت کسی نے نہیں جانی۔

۸۔ احد سے احمد بھیو ایک جوت دی ٹھانوں

بھیو جگت کے تار نا پڑیو محمدانوں

ترجمہ { احد سے احمد ہوئے ایک نور دو جگ دنیا کا نگہبان ہوا اور

محمد نام پڑا۔

۹۔ جہاں لو بھرتہنہ لا بھرتہ کوئی جہاں لا بھرتہنہ لو بھرتہ ہوئی
ترجمہ { جہاں لا لچ ہوتا ہے وہاں فائدہ نہیں ہوتا اور جہاں فائدہ
ہوتا ہے وہاں لا لچ نہیں ہوتا۔

۱۰۔ جھمن پریم کہاں تن مانسو کا یا رکت نہ نین آسو
ترجمہ { جس دل میں محبت ہے اس میں گوشت یعنی نفس کہاں اس
کے تونہ جسم میں خون ہوتا ہے نہ آنکھوں میں آنسو۔



۳- پاره‌ها

ہمچو ہندی زن کسے در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمعِ مردہ کار ہر پروانہ نیست

شیخ علی حزیں کا یہ شعر صرف ہندو عورتوں پر صادق نہیں آتا
بلکہ کم و بیش ہندستان کی تمام عورتوں کے جذبات کی خاکہ کشی کرتا ہے
خواہ وہ کسی فرقے اور ملت سے متعلق کیوں نہ ہوں۔

اپنے شوہر سے جو محبت ہندستانی عورت کرتی ہے ویسی تو کیا
اس کا عشرِ عشیر بھی دوسرے سے ممکن نہیں۔

اس کی ”آہ“ میں درد اور اس کی ”واہ“ میں رازِ شگفتگی کھنچا ہوا
چلا آتا ہے۔

وصل کا سکون اور ہجر کی بے چینی دیکھنی ہو تو کسی ہندی عورت
کے وہ جذبات جن کا اظہار وہ ان ہر دو مواقع پر کر رہی ہو ملاحظہ
فرمائیے۔ آپ اپنے میں ایک قسم کی بالیدگی محسوس کریں گے جو
روح سے تعلق رکھتی ہے۔

کون ہندستانی ہجراں نسیب عورت ہے جس نے اپنے آہ و نالہ
سے دوسروں کو متاثر نہیں کیا۔ اور کون ہندی بیوی ایسی ہے جس
نے آغوشِ وصل میں اگر محبت کی چاشنی کا مزا چکھایا ہو اور
دنیا بے کیف رہی ہو۔

مبارک ہے وہ عورت جس کا جذبہ لطیف ہجر کے غم اور
وصل کی خوشی سے دنیائے محبت میں ایک کیف پیدا
کر دیتا ہے۔

یوں تو اہل دل کے لیے ہجر و وصل دونوں ایک خاص لطف

رکھتے ہیں لیکن کچھ تو ہجراں نصیبی کی فراوانی اور کچھ اہل دل کا غم سے زیادہ میل بول، ان دو باتوں نے داستانِ ہجر کو بہ نسبت افسانہٴ وصل کے زیادہ عام کر دیا ہے چنانچہ ہر آنکھ میں اشکِ ہجر نظر آتے ہیں اور خال خال نہیں بلکہ بکثرت۔ یہ اور بات ہے کہ کسی جگہ اس کا اظہار مرد کی طرف سے ہو اور کہیں عورت کی جانب سے۔ ہندوستانی معاشرت چونکہ مردوں کو بہ نسبت عورت کے بلند مرتبہ دیتی ہے۔ شاید اسی خیال سے اس معاشرت میں ہجر کے غم میں چیخ اُٹھنے کو اُس کی شان کے منافی قرار دے کر ایسے جذبات کے اظہار کا رواج عورتوں ہی کی طرف سے کیا جاتا ہے اور جذبات کا اظہار وہ مردوں سے بہتر کر بھی سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی زبانیں جو اپنی خلقت کے لیے کلیتاً یہاں کی معاشرت کی رہیں منت ہیں اسی طریقہٴ مخاطب و اظہار جذبات کو اپنائے ہوئے ہیں۔

ہندی عورت کی ہجراں نصیبی کی داستانیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی داستانِ غم نے ہندی ادب میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لی ہے اور جو مقبولیت بارہ ماسا — یعنی بارہ مہینے کے "ہجری داستانِ غم" کو حاصل ہے اس سے گویا سبھی واقف ہیں۔

غالباً اسی اعتبار سے شاعر جالنسی نے بھی پرمادیت میں شوہر کے ہجر میں ناگمتی کی بیقراری اور نالہ و غم کی تصویر کشی کی ہے جس میں اس اثر کے علاوہ جو ہر افسانہٴ غم میں ہوتا ہے شاعرانہ محاسن اور تشبیہات اور استعارے کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔

سب سے بڑی خوبی جو شاعر جاسی کے "بارہ ماسے" میں ہے وہ تشبیہات اور استعاروں کا مقامی اور ہندی ہونا ہے۔ ان کی تلاش کے لیے ملک صاحب ایران توران نہیں گئے بلکہ "قضیہ زمین بر سر زمین" کر کے ہم کو جذبہ قومیت سے بھی آشنا کر دیا ہے۔

ناگمتی کے بارہ ماسے کے بعد ہزاروں بارہ ماسے ہندو اور مسلمان دونوں نے لکھے لیکن شاعر جاسی کا "بارہ ماسہ" ہندی ادب کی پہنائی (وسعت) میں آپ اپنی نظیر ہے۔

ہندی عورت کی محبت کے عنوان ظاہر کرنے اور نیز یہ بتانے کے لیے کہ ایک باکمال شاعر زبان کو الفاظ کی تلاش اور جذبات کے بر محل صرف سے اس میں واقعیت کا کیسا رنگ بھر سکتا ہے "بارہ ماسے" کا اقتباس ترجمے کی شکل میں حاضر کیا جاتا ہے۔ اصل عبارت دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر اور مترجم کی ستم ظریفیوں کے ہاتھوں پامال ہو کر جتنی با اثر باقی رہ جاتی ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں لیکن اگر ترجمے کی تمام خامیوں کے باوجود کلام کی قوت، اس کا اثر، اس کی روانی اور

۱۔ سنسکرت لٹریچر میں "نک سنگ" (سراپا، کثرت سے پایا جاتا ہے اور ہمارے پاس کافی دلیلیں اس امر کے ثبوت کی ہیں کہ اس بارے میں جاسی نے اپنے پیش رو شعرائے سنسکرت سے استفادہ کیا۔ مگر اس کا بارہ ماسہ اپنے رنگ کا ایک ہی ہے۔ ہر ہندی داں جانتا ہے کہ بارہ ماسہ کیسا عام پسند اور ہر دل عزیز ہے۔ جاسی کے زمانے سے اب تک بے شمار بارہ ماسے لکھے گئے لیکن اس کے بارہ ماسہ کو کوئی نہ پہنچا۔

(مضمون لالہ سیتا رام۔ مندرجہ ذیل آباد ہسٹریز ۱۹۳۰ء)

بلند تخیلات پڑھنے والے کو اصل عبارت کی طرف متوجہ کر سکیں تو ظاہر ہو کہ اصل عبارت کتنی موثر، پُر شکوہ اور رواں ہوگی۔
گو یہ "بارہ ماسہ" پدماوت ایسی ضخیم کتاب کا ایک معمولی جزو ہو لیکن زبان، طرز ادا، تشبیہ روانی، شیرینی اور سب سے بڑھ کر اپنے جذبات کی بنا پر بذات خود ایک تصنیف ہے۔ یہ بھی ایک وجہ یا عذر اس کے پیش کرنے کا ہو سکتا ہے۔

ناگمتی کا شوہر رتن سین اُسے چھوڑ کر پردیس چلا گیا ہے ناگمتی رانی ہے اور ایسی رانی جو اپنے شوہر پر کافی حاوی ہے لیکن پھر بھی عورت ہے!! رتن سین ایک دوسری عورت کے فراق میں جوگی بن رہا چلا چلا جاتا ہے اور سال بھر تک واپس نہیں آتا۔ اس درمیان میں ہندستان کا ہر موسم گزر گیا لیکن ناگمتی کا ہجر وصل سے نہ بدلا۔ شوہر کی فکر، سوت کی ڈاہ غرض سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ طرح طرح کے خیالات نے اور بھی زندہ درگور کر دیا تھا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا، بجھایا کہ رانی! جی بد مزہ نہ کرو۔ اٹھو آئیے میں اپنی صورت تو دیکھو، سوچو، سمجھو اور دل کو قابو میں کرو۔ دیکھو بھنورا کتوں کے ساتھ رہتا ہے لیکن جب المتی کو یاد کرتا ہے تو کیسا دڑا ہوا آتا ہے۔ بادل کو زمین سے محبت ہی تو ہوتی ہے کہ گھوم پھر کر کس طرح اُسے سیراب کرتا ہے ناحق اپنے کو اس طرح ہلاک کرتی ہو۔ تمہارا شوہر جب تمہیں یاد کرے گا دڑتا ہوا آئے گا۔ لیکن یہ سب سمجھانا، بجھانا بیکار تھا۔ شدت غم کا یہ نتیجہ ہوا کہ رانی ہونے کی لاج بھی کھوئی۔ ناگمتی نے گھر بار چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور دیوانہ وار پھرنے اور جان

کھونے لگی۔

ناگتی نے جس بے چینی سے جدائی کے دن کاٹے اس کا تذکرہ بھی ”بارہ ماسے“ میں موجود ہے۔ ایک ایک چوپائی میں ایک ایک پہینے کی کیفیات کو زے میں دریا کی مصداق ہے۔
ملاحظہ ہو:-

بارہ ماسہ

اساڑھ لگ گیا نہ بادل گرج رہے ہیں۔ اودے اور کالے پنکھ، پکھرو، چیل، کوٹے آسمان پر اڑ رہے ہیں۔ سفید لگے قطار در قطار دوڑ رہے ہیں۔ بجلی کی تلوار چاروں طرف چل رہی ہے۔ بوندیوں کے تیر زور و شور سے گر رہے ہیں۔ گھٹائیں اُمنڈ اُمنڈ کر آرہی ہیں! فوج ہجر میں باجے بج رہے ہیں۔ جدائی کا دکھ بڑھتا جا رہا ہے۔ شوہر دیس سے باہر ہو اور نہیں آپے سے۔

کچھ نچھتر سر پر آگیا۔ مینڈک، مور اور کوکلا مست ہو کر پی ہو۔ پی ہو کہہ رہے ہیں اور نئی بجلی کی چمک سے سہمی ہوئی خاموش !!
یہ موسم برسات کا اور نئی ایسی خشک !! کون مکان درست کرے اور کون تخم ریزی کرے میری تو کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔
جس کا شوہر گھر میں ہی اُسی کو تمام عیش و آرام اور عزت حاصل ہو۔ میرا ”پیا“ تو پردیس ہی مجھے سارا سکھ، چین بھول گیا۔
ساون کے پانی سے کھیتوں میں بھرنی لگی لیکن میں سوکھی کی سوکھی ہی ہوں۔ ”پنر بس نچھتر“ بھی لگ گیا لیکن ”پتیم کے درشن“

نہ ہوئے۔ اے پیارے تمہارے فراق میں میں باولی ہو گئی ہوں میرے
آنسو زمین پر سیر ہوئی کی طرح رینگتے پھرتے ہیں۔

سکھیں نے اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ہنڈولا رچایا ہے
— ہری زمین اور بسنتی چولیاں — اور مجھے فراق پیٹگیں دے
دے کر جھلا رہا ہے۔ میرا دل بھنبھیری کی طرح بھٹکا پھرتا ہے، راہ
نہیں سو جھتی — ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ میرے دل کی ناؤ بقیہ کیوں
کے تباہی میں پڑی ہوئی ہے۔

اے پیارے تم تک کیسے پہنچوں نہ میرے پاؤں میں نہ پنکھ ہے۔
بھادوں کی کالی راتیں اکیلے کیسے کاٹوں۔ شوہر نے تو دوسری
بستی بسائی ہے۔ بستر ناگ کی طرح دھردھ کے ڈستا ہے اکیلی ایک پٹی سے
چمٹی پڑی ہوں۔ آنکھیں کھولتی ہوں تو ڈر لگتا ہے بجلی چمک کر اور
بادل گرج کر ڈراتے ہیں۔ جب گھٹا جھکورے سے برستا ہے تو میری
آنکھیں اولتی کی طرح ٹپکتی ہیں، دل پھٹا جاتا ہے۔ جدائی جان کو
لگ گئی ہے۔ یہ مہینا تو پہاڑ ہو گیا۔ کاٹے نہیں کٹتا۔ بھرے بھادوں
میں ایسی خشک ہوں اور تم کو خبر تک نہیں۔

پانی کی باڑھ سے جل جھل، زمین آسمان سب ایک ہو رہے
ہیں اور میں جوانی کے اتھاہ جل میں ڈوب رہی ہوں۔ پی پیائے
ہاتھ میں ہاتھ دو!!

کنوار لگ گیا۔ پانی گھٹ رہا ہے۔ اب بھی آ جاؤ پیارے بھٹائے
آنے سے ترقی بازی پیدا ہوگی۔

آؤ پیارے آؤ دیکھو پیسے "پی پی ہو" "پی پی ہو" کر رہے ہیں۔ سہیل

نکلا ہے۔ "ہتھیا پنچر" شروع ہو گیا۔ راجا زمین کس کے میدان کو جا رہا ہے۔ آب نیساں سیپ کے مُنہ کو موتیوں سے بھر رہا ہے۔ سمندر اور سیپ سب موتی سے بھر گئے۔ ہنس سمندر کو یاد کر کے چلے آئے ہیں۔ سارس کلیل کر رہے ہیں۔ سبزہ اُگ رہا ہے جنگل تک پھول رہے ہیں اب تو آجاؤ!!

دیکھو غم فراق مجھے کس طرح تباہ کیے ہوئے ہے۔ اے مرے کرشن آکر مجھے اُس سے نجات دلاؤ!!

کاتک کی چاندنی کتنی ٹھنڈی ہے تمام عالم سرد ہے ایک بیش جل رہی ہوں۔ مرے تن من کو بستر جلانے ڈالتا ہے۔

سارے سنسار میں دیوالی کی دھوم مچی ہے۔ سکھیاں جھومک گا رہی ہیں لیکن مجھے کیا مری جوڑی تو مجھ سے بچھڑ گئی مجھے تو دنیا آجاؤ معلوم ہوتی ہے۔

سکھیاں دیوالی گا کر تیوہار منا رہی ہیں میں کیا گاؤں تھاری جدائی میں "بے سدھ" ہوں۔ اے دلدار دیکھو اب بھی آجاؤ۔

اگن کی بھاری راہیں بہت دشواری سے کٹتی ہیں۔ اس طرح جلتی ہوں جیسے چراغ میں بتی۔ دل سردی سے تھر تھراتا ہے تم ہوتے تو ایسا کیوں ہوتا۔

گھر گھر سجاوٹ ہے۔ میں کیا سنگار کروں میرا رنگ روپ تو شوہر کے ساتھ گیا۔ وہ پلٹے تو یہ پلٹے۔

سُگ سُگ کر خاک سیاہ ہو گئی۔ اب "برہ" کی آگ میں جل رہی ہوں۔ اس دُکھ درد کو پیارا کیا جانے۔

ای بھنورے، اسی کو تے پیتم کو مری سنانی یوں سنانا کہ وہ برہ کی آگ میں جل گئی اُسی کا دھنواں ہو جو ہم کو لگ گیا ہو۔
 پائس کے جاڑے میں بدن تھر تھر کانپ رہا ہو سورج ڈوبتے ہی سردی نے زور باندھ دیا۔ بستر گویا برف میں ڈوبا ہوا ہو۔ کانپ کانپ کر جی نکلا جاتا ہو۔ ”پیتم“ کہاں کہ اس کو گلے سے لگا لوں۔
 چکوی رات کی جدائی کے بعد دن کو ملتی ہو۔ ایک نئی ہوں کہ دن رات ”برہ میں بیا کل“

خون بہا، گوشت گلا، ہڈیاں سنکھ ہو گئیں۔ عورت ”پنی ہو“ ”پنی ہو“ رٹ کر مر گئی۔ جب سکھی نہیں تو زندگی کیسی ہے۔
 ماگھ کا مہینا ہو۔ پالا پڑ رہا ہو، جتنا جتنا روتی کے پہل سے بدن کو ڈھانکتی ہوں اتنا ہی دل اور کانپتا ہو۔
 آنکھوں سے آنسو اس طرح بہتے ہیں جیسے مہاوٹ ہو رہی ہو۔
 تمہارے بغیر پانی تلوار سا لگتا ہو۔ فراق ہو ابن کر جھوٹے مار رہا ہو۔
 کہاں کا بناؤ اور کیسا سنگار۔ فراق میں ڈورے کی طرح ہو گئی ہوں۔
 جاڑا تو مجھ برہ کی ماری کے لیے آفت جان ہو گیا۔ اسی پیارے سورج ہو کر تھو کہ تم بن ماگھ کا جاڑا جانے کا نہیں۔ تمہارے بغیر جسم بے جس ہو اور دل بے قابو اس پر بھی فراق کو چین نہیں چاہتا ہو کہ جلا کر ”بھسم“ کر دے۔

پھاگن میں ہول کے جھونکوں نے سردی کو چوگنا بڑھا دیا ہو۔
 وہ تو اب سہی نہیں جاتی۔ بدن پتے کی طرح زرد ہو گیا پھر بھی فراق باز نہیں آتا جھکھو رے دیے ہی جاتا ہو۔

پتے جھڑ گئے اور از سر نو پھر پھول پتے شاخوں میں آئے سب
کو خوش دیکھ کر میرا دل دوبارہ بخیدہ ہوا۔

سارا سنسار مل کر پھاگ کا رہا ہے اور میرا بدن مثل ہولی کے
جل رہا ہے۔ میرا یوں جلنا پیارے تم کو اگر پسند ہے تو پھر مجھے کوئی
غم نہیں۔ میری تو خواہش ہی یہ ہے کہ میں تمہاری مرضی بجالاؤں
کہ مٹی ٹھکانے لگے۔

اب تو میرے جی میں یہی آتا ہے کہ اپنا بدن جدا کر اُس کی
راکھ ہو میں اُڑا دوں کیا تعجب یہ اُس راستے پر جا پڑے جس پر
تو قدم رکھتا ہے۔

چیت کے ساتھ بسنت رت بھی آگئی ہر طرف دھما دھما رہی ہے۔
لیکن میری دنیا سُنی ہے۔ کوئل کا پنچم راگ جدائی میں تیر سا لگتا ہے۔
میرے خون کے آنسوؤں سے سارے بھاڑ جھنکار لت پت ہیں۔
ٹیسو اور مجیٹھ کو میں نے ہی رنگ دیا ہے۔ بالم آم میں بورا گئے
اب تو گھر کی یاد کرو اور آؤ۔ جنگل میں ہزاروں طرح کی پتیاں ہوتی ہیں
لیکن بھنورا مالتی ہی کی تلاش کرتا ہے۔ نارنگی کی شاخ بہار پر ہے
اس کو فراق کا ہے کو باقی رہنے دے گا جس طرح کبوتر اپنے گھر
پر ٹوٹتا ہے پیارے اُسی طرح آجاؤ۔ میں فراق کے پنچے میں ہوں بغیر
تمہارے کیسے چھوٹوں۔

بسیاکھ میں لباس بار اور چندن آگ معلوم ہوتا ہے۔ سورج
کی گرمی شوہر کی چھانٹو سے سرد ہو سکتی ہے۔ آؤ پیارے انگاروں
پر لوٹ رہی ہوں۔ تمہارے ہی آنے پر ٹھنڈی ہو سکتی ہوں۔ آؤ

اور آگ کو گلزار کرو۔ تمھاری جدائی میں بھاڑ کی طرح جل رہی ہوں۔
تم جتنا چاہے جلاؤ تمھارا دروازہ نہ پھوڑوں گی۔
دل کا تالاب روز بروز گھٹتا ہی جاتا ہے اور وہ وقت قریب
ہے جب اس کی زمین ترک جائے۔

(امید کا) کنول جو اس تالاب میں کھلا تھا "بن جل" مر جھا گیا
اگر تم آکر "پریم جل" سے سینچو تو اب بھی اس کی بیل پھل پھول
سکتی ہے۔

جیٹھ کا مہینا ہے۔ سنسار تپ رہا ہے، لا چل رہی ہے، بگولے
اٹھ رہے ہیں، انگارے برس رہے ہیں اور برہ کی آگ لٹکا پھونک کر
اب مجھے جلا رہی ہے۔

چاروں اذ کی ہوا آگ برسا رہی ہے، لٹکا کو جلا کر پلنگ کو لگی
ہے، جسم جل کر سیاہ ہو گیا۔ جدائی کی آگ کیسا پوشیدہ کام کرتی ہے۔
آندھی اٹھ رہی ہے۔ آگ برس رہی ہے، مجھ دکھیا کو کچھ سمجھائی
نہیں دیتا۔ ادھ جلی ہو گئی ہوں، بدن کا گوشت سوکھ گیا۔ فرق موت
بن کے پیچھے پڑا ہے مانس کھا کر اب ہڈی چبا رہا ہے۔ ہر شام کو تمھاری
راہ دیکھتی ہوں۔ اسی کرشن کی صورت والے اب بھی آ جاؤ تم کو آتما
دیکھ کر وہ بھاگ جائے گا۔

اے تھمر جو ایسی آگ میں جلے جس کو کوئی سمجھا نہ سکتا ہو اس کو
سر ہنا چاہیے۔

اس طرح درود کے بارہ مہینے بسر کیے، ہزار دکھ درد ایک ایک
سانس میں جھیلے، ایک ایک پل پہاڑ ہو گیا اور ایک ایک پہر، ایک

شاعر جاسی کی بھاکا

شاعر جاسی کی تصانیف آج سے تقریباً چار برس قبل کی ٹھیکہ
 ”اودھی بھاکا“ (اودھ کی زبان) میں لکھی گئی تھیں لہذا یہاں اودھی
 زبان کے متعلق ضروری معلومات درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اودھی زبان کی تاریخ | افسانوی عہد پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے
 اس لیے اودھی زبان کی صحیح تاریخ بتانا
 دشوار سا ہو گیا ہے۔ یقین کے ساتھ صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ برج بھاشا
 کی طرح اودھی بھی خالص ہندستانی زبان ہے۔ البتہ ایسی نہیں کہ دنیا
 کے پردے پر ازل سے رہی ہو۔ گیا رھویں صدی عیسوی کے
 لگ بھگ اس زبان نے جنم لیا۔ اس کی عمر گویا آٹھ نو سو برس ہے۔

لے اُردو میں حسب ذیل الفاظ ملک محمد جاسی ہی کے رائج کیے ہوئے
 ہیں۔ اُن سے قبل یا تو وہ قطعاً بولے ہی نہ جاتے تھے یا اُن کا استعمال
 نہ ہونے کے برابر تھا۔

اردو میں رائج الفاظ	ہندی میں رائج الفاظ
انکارہ، سو جھنا، جگ، پل، درپن، ہراہے،	طل، امیر، امر، سلطانی، سرتاج،
گرگھ، جھان، بنجارا، پنخت، مایا، گھنگھ،	میر، چنر، شیطان، اسلام، اسوار، دیار
چندن، ج دینا۔	شاہ۔

ہسٹری آف اردو لٹریچر مؤلفہ رام بابو سکسینہ صفحہ ۱۱۔

اودھی زبان کی خصوصیات

اودھی بولی دونوں سے کئی باتوں میں مختلف ہے۔ مثلاً
۱۔ خالص اودھی کی بول چال میں فعل، فاعل کی ضمیر جنس اور تعداد سے مطابقت رکھتا ہے۔ مفعول سے اس وقت بھی مطابق نہیں ہوتا جب کہ فعل متعدی ہو۔

۲۔ دو سے زیادہ اجزائے الفاظ کے شروع میں "ای" "ہ" اور "اؤ" "ھ" کا تلفظ اودھی کو پسند اور کچھ ہندی (کھڑی بولی اور برج بھاشا) کو ناپسند ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے ایک ہی لفظ کو اودھی میں بالکسریا بالضم جلی اور کھڑی بولی اور برج بھاشا میں بالکسریا بالضم خفی بولتے ہیں۔ مثلاً اودھی میں

‘سییاج	‘کییاھ	‘پییار	‘نییاہ
بیاج	بیاہ	پیار	نیاہ
‘بییاج	‘بییاھ	سییار	‘کییاری
بیاج	بیاہ	سییار	کیاری
پییار	‘نییاہ	دوہار	کییاری
پیار	نیاہ	دوہار	کیاری

۳۔ اودھی کا یہ اصول اردو قواعد کے بھی خلاف ہے۔ اودھ کے رہنے والے اردو بولتے وقت عموماً یہی غلطی کرتے ہیں یعنی فعل متعدی استعمال کرتے وقت بھی فعل کی مطابقت مفعول سے نہیں کرتے۔ مثلاً بعض اوقات وہ کہتے ہیں کہ "میں نے روٹی کھایا" حالانکہ ہونا چاہیے "میں نے روٹی کھائی"۔

اسی طرح "آ" اور "ا" کے بجائے اودھی کو "ھ" یا تے معروف پسند ہے۔ اور برج بھاشا کو "یا" یا تے مجہول مثلاً اودھی میں "آئی"۔ "جائی" بولیں گے اور برج بھاشا میں "آئے" "جائے"

۳۔ ”ہونا“ فعل کی شکلوں کے مادے میں جو صرف ”ج“ پہلے رہتا ہو۔ وہ اب تک اودھ کے کچھ حصوں میں — جائس اور میٹھی کے آس پاس — بولا جاتا ہو۔ مثلاً ”جھ“ ”ہی“ کے بجائے اسے ”جھہ“ کہیں گے۔ شاعر جائس نے ابا ”جھہ“ کہا ہو ممکن ہو بولا جاتا ہو۔

۴۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں میں جو "صفات" اور تیلیکی ضمائر "ا" "او" "آو" پر ختم ہوتے ہیں وہ اودھی میں بلا "ا" "او" "آو" کے ہوتے ہیں۔

کھڑی بولی برج بھاشا اودھی
ایسا ایسو ایس پاس

جیسا	جیسو	جیس یا جس
چھوٹا	چھوٹو	چھوٹ
اپنا	اپنو	اپن
میرا	میرو	مور
تیرا	تیرو	تور
ہمارا	ہمارو	ہمار

کھڑی بولی میں تذکیر میں "کا" اور تانیث میں "کی" آتا ہے۔
 برج بھاشا کا بھی یہی اصول ہے۔ اودھی کی بول چال میں تو یہ فرق
 ظاہر نہیں ہوتا البتہ ادبی زبان میں فرق ملتا ہے۔ شاعر جاسی نے
 تذکیر میں "کر" اور تانیث میں "کے" یا تے مجہول سے استعمال کیا ہے
 جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اودھی میں تانیث میں "کی" یا تے معروف
 سے کبھی نہیں ہوتا "ے" یا تے مجہول ہی سے ہوتا ہے۔

۶۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں میں حرف جار ہمیشہ فعل
 کے سادہ شکل میں لگتے ہیں جیسے "کرے کو" "کرن کو" لیکن ٹھیٹھ یا
 پوربی اودھی میں حروف جار ضمیر واحد متکلم میں لگتے ہیں جیسے "آئے کنھ"
 "کھائے ماں" "بیٹھے کر"

۷۔ اودھی میں فعل حال ناتمام (PRESENT INDEFINITE TENSE)

کی شکلیں برج بھاشا ہی کی سی ہوتی ہیں حرف ضمیر واحد حاضر
 کی صورت میں سنسکرت کی طرح "س" "سی" ہوتا ہے جیسے
 "کرسی" "کرس" وغیرہ۔ امر میں بھی یہی صورت قائم رہتی ہے۔
 گو کبھی کبھی آخر میں "ہی" "ہی" لگا دیتے ہیں۔

۸۔ اودھی میں ضمیر متکلم فعل حال کے جنس تانیث کی صورتوں میں ”ہسی“ اور ”ہنی“ کی جگہ پر ”ہسی“ اور ”ہنی“ ہوتا ہے۔ جیسے ”گہنی“، ”لہنی“ وغیرہ۔ بول چال میں اکثر آخری ”نی“ نکال کر بچے ہوئے جز کی آواز کو نون غنہ سے بدل دیتے ہیں جسے ”لہنی“ ”گہنی“ کی جگہ ”لہنی“ ”گہنی“ بولتے ہیں۔ شاعر جاسی نے بول چال کے اس روپ کو بھی دکھایا ہے۔

۹۔ پوربی اودھی میں ماگدھی کے رواج کے مطابق برج بھاشا کے ”او“ سے ضم ہونے والے ضمائر کی جگہ ”اے“ سے ختم ہونے والے ضمائر استعمال ہوتے ہیں جیسے کو، کون کی جگہ ”کے“ ”جو“ کی جگہ پر ”جے“ زیر کے ساتھ اور کو و کو کی جگہ پر ”کیو“ ”یا کیو“۔

۱۰۔ پوربی ہندی اور اودھی میں کہیں کہیں حرف جار مضمہ ہوتے ہیں۔

۱۱۔ ٹھیٹھ اودھی میں مستقبل کی شکلیں کچھ بچ کی ہوتی ہیں مثلاً ہونے۔ پاؤب وغیرہ

۱۲۔ ”ہونے“ پرانا لفظ ہے۔ اب اس کے بجائے ”ہوتی“ بمعنی ”ہوگا“

بولتے ہیں۔

۱۳۔ ”پاؤب“ یہ لفظ اودھی ادب کے جملہ ضمائر میں مستقبل ہو گو بول چال میں محض ضمیر جمع متکلم بھی ”ہم“ ہی کے ساتھ آتا ہے۔ شاعر جاسی نے جملہ ضمائر اور دونوں عددوں میں اس کا استعمال کیا ہے۔

پوربی اودھی میں مصدر کا اختتامی حرف بھی ”ب“ ہوتا ہے جیسا ”پاؤب“ میں ہے۔

برج بھاشا شاعری کی خصوصیات | برج بھاشا کی شاعری

خصوصیت جو اُس کو اکثر دوسری زبانوں خاص کر اُردو سے ممتاز کرتی ہے اُس کا انداز مخاطب ہے۔ مایوسی، رنج، درد اور خوشی کے جذبات جس خوبی سے بھاشا کی شاعری میں ملے ہوئے ہیں دوسری زبان مشکل سے اتنی صحت ادا پر قدرت رکھتی ہے۔ غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بھاشا کی شاعری میں جذبات کا اظہار عموماً عورت ہی کی طرف سے کیا جاتا ہے جو گویا مجسم کرب و اضطراب ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بھاشا کی شاعری میں استعارے اور تشبیہات عام اور مقامی ہوتے ہیں جو شعر کو واردات کا درجہ دے دیتے ہیں۔

۱۷ اودھی اور برج بھاشا کی شاعری کی ابتدا کی صحیح تاریخ متعین کرنا دشوار ہے کہا تو یہ جاتا ہے کہ ۱۲ء سے قبل ہی اس کی ابتدا ہو گئی تھی اور "پنشنے نانید" نام کا ایک شاعر ۱۲ء میں تھا لیکن اس کا کوئی کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ اسی طرح بار دہتر شاعر کا وجود ۱۸ء میں بتایا جاتا ہے لیکن کلام اس کا بھی محفوظ نہیں ہے۔

"چند بردائی" ہندی کا پہلا شاعر ہے جس کا کلام ہم تک پہنچا ہے اس کی موکلہ آزاد تصنیف "پرمتی راج راسو" عہد پرمتی راج کا ایک روشن کارنامہ ہے جس کا حجم تقریباً ڈھائی ہزار صفحے کا ہے۔ اسی کو ہندی کا باوا آدم کہہ سکتے ہیں۔

۱۸ اُردو شاعری پر عام اعتراض ہے کہ اُس میں جذبات و احساسات اول تو غیر فطری ہیں اور حسن و عشق کے افسانوں تک محدود ہوتے ہیں۔ عاشق و معشوق کی محبت کے علاوہ دوسری قسم کی محبت کا انداز اُردو شاعری میں خالص غزل نظر آتا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بھاشا کا شاعر معمولی سی معمولی بات کو اس ڈھنگ سے بیان کرتا ہے کہ اُس میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے۔

چوتھے یہ کہ بھاشا کے تھوڑے سے الفاظ کثیر معانی پیدا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بھاشا کی شاعری حسن و عشق، درد و غم، محاکات اور تخیل حسن ادا اور موسیقی کی ایک دل گداز تصویر ہوتی ہے۔

ملک محمد جالنسی کی پداوت اور دوسری تصانیف بھاشا شاعری کی جملہ خصوصیات کی تفسیر ہیں۔ ملک صاحب کا بارہ ماسہ، ان کا طرز ادا، اُن کے استعارات، تشبیہات اور الفاظ کا انتخاب بھاشا شاعری کی خوبیوں کی حامل ہیں۔

۱۔ اوزان کو پورا کرنے کے لیے

الفاظ کا بے محل استعمال یا قواعد کے اصولوں سے چشم پوشی شاعر جالنسی کے یہاں بھوکے نہ ملے گی۔

۲۔ کہیں کہیں تو غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔ کہاوتوں، محاوروں

۱۔ مصنف جالنسی گرنٹھاولی کا قول ہے کہ کہیں کہیں قواعد کے خلاف ایک آدھ لفظ مل جائے تو مل جائے جملے کے جملے ڈھیلے اور بے ڈھنگے کہیں نہیں گئے۔ مصنف گرنٹھاولی کا قول محض قیاس ہی ہے لیکن اگر واقعی ایک آدھ لفظ قواعد کے خلاف ملے بھی تب بھی ترتیب میں جس وسعت اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے اس کا اندازہ کرتے ہوئے ایسے الفاظ کو خلاف قواعد کہنا درست نہ ہوگا خاص کر جبکہ اس وقت کی قواعد کا مطلق ہم کو علم بھی نہ ہو۔

اور ضرب الامثال کا استعمال بھی شاعر جاسی نے کیا ہے۔ لیکن وہ بھاشا کے فطری طریقے سے نہ کہ محض شعر کے حسن ظاہری میں اضافہ کرنے کی غرض سے۔

۳۔ البتہ بعض مقامات پر مخدوفات کا عیب ضرور موجود ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی بادی النظر میں مطلب خبط سا ہو جاتا ہے بعض مقامات پر تعقید کا عیب بھی ملتا ہے لیکن یہ عیوب خال ہی خال نظر آتے ہیں۔

۴۔ شاعر جاسی کے دو لفظوں کا استعمال پڑھنے والے کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا۔ انھوں نے ”زاس“ لفظ کا استعمال ”جو کسی کا ساتھی نہ ہو“ کے معنوں میں کیا ہے۔

دوسرا لفظ ہے ”بسواس“ جسے شاعر جاسی ”بسواس گھات“ کے معنوں میں لاتے ہیں۔ اسی طرح ”بسواسی“ ”بواس گھاتی“ کے معنوں میں کئی جگہ لایا گیا ہے۔ (بسواس گھات - فریب دینا - بسواس گھاتی - دغا باز)

۵۔ شاعر جاسی نے کہیں کہیں بہت پُرانے الفاظ استعمال کیے ہیں مثلاً ”دن کر“ بمعنی سورج کو ”دن ار“ لکھا ہے۔ ”شش دھر“ کی بجائے ”سسہر“۔ ”بھوپال“ بمعنی راجا کے بجائے ”بھوال“۔ ”شش دھر“ بمعنی سانپ کے بجائے ”سسہر“

اسی طرح ”آد“ ”آدی“ کا استعمال ”بالکل“ کے معنوں میں اب صرف بنگلہ زبان ہی میں سنائی دیتا ہے۔ لیکن شاعر جاسی نے پدمات میں اسے استعمال کیا ہے۔

ایک بہت پرانا لفظ ہے ”پے“ ”اے“ ”جو“ ہی کے معنوں میں

آتا ہے۔ شاعر جاسی نے اس کو بھی استعمال کیا ہے۔
ایک اور پُرانا لفظ ہے ”پشے“ جس کے معنی ہیں ”پر“ اس کو بھی
ملک صاحب لائے ہیں اور ”بھے“ کو بھی استعمال کیا ہے جس کے معنی
ہیں ”سے“

۶۔ ملک صاحب بعض مقامات پر نئے پرانے اور پوری پچھی
دونوں طرح کے الفاظ لائے ہیں مثلاً پر اکرت کا ایک لفظ تھا ”سننو“
”سنتی“ جو سے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کی ہندی
شکل ”سینتی“ ”سنتی“ بہت دنوں تک مستعمل رہی۔ وکی دکنی
ایسے اُردو کے پرانے شعرا تک نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے شاعر جاسی
اس لفظ کو بہت جگہ لائے ہیں۔

۷۔ ضرورت شعری کی بنا پر اکثر حروف کو بدل دیتے ہیں مثلاً
”دل“ کے بجائے ”در“ ”بل“ کے بجائے ”بر“ استعمال کرتے ہیں۔
ملک محمد جاسی نے ایسا بہت کیا ہے۔ انھوں نے ”نزل“ کے بجائے ”نمر“
اور ”کلا“ کے بجائے ”کرا“ بھی استعمال کیا ہے۔ ضرورت شعری کی بنا پر مفرد
الفاظ کو انھوں نے مرکب بھی کر دیا ہے مثلاً ”ہنس“ کو ”ہنسا“ ”بول“ کو ”بولا“
۸۔ بول چال میں تلفظ کو مختصر کرنے کی عادت مستحسن منظور ہوتی ہے۔
اسی لحاظ سے ”کر“ کی جگہ ”ک“ بول دیتے ہیں۔ شاعر جاسی کے
یہاں یہ مختصر شکل اکثر ملتی ہے۔

۹۔ ہندی کے اکثر شعرا پر لفظوں کے توڑنے مڑنے اور
اُن کی شکلوں کے مسخ کرنے کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔ شاعر جاسی
اس الزام سے بلند ہیں۔ پڑھتے وقت مصرع کے آخری مفرد لفظ

کو مرکب کر دینے میں جتنا فرق لفظوں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے اُس سے زیادہ اُن کے الفاظ کی شکل کہیں نہیں بگڑتی۔

۱۰۔ شاعر جاسی نے ٹھیٹھ اودھی الفاظ کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے مثلاً اُنھوں نے ”راندھ“ لکھا ہے جس کا استعمال اب صرف مرکب شکل میں رہ گیا ہے جیسے ”راندھ پروسی“ اس کے علاوہ بھی ٹھیٹھ اودھی الفاظ ہیں جو ہندی ادیبوں کو دیہاتی معلوم ہوں گے مثلاً ”نوج“۔ ”موکا“ ”مہوں“ وغیرہ۔

۱۱۔ شاعر جاسی نے ”تو“ یا ”تیں“ کی جگہ پر اکثر توی تہج کا استعمال کیا ہے۔ یہ قنوجی اور کچھی کی وہ شکل ہے جو کھیری اور شاہجہاں پور سے لے کر قنوج تک بولی جاتی ہے۔

شاعر جاسی کی زبان بول چال کی سیدھی سادھی ہے۔ مرکب الفاظ اول تو اُنھوں نے بہت کم استعمال کیے ہیں۔ جہاں کیے بھی ہیں دو سے زیادہ اجزاء کے الفاظ نہیں لائے — دو اجزاء کے جو مرکب الفاظ استعمال کیے بھی ہیں ان کو مفرد ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ سنسکرت کے طریقے کے مطابق نہیں بلکہ فارسی کے طریقے پر ہیں۔ جہاں بعض بظاہر مرکب الفاظ دراصل مفرد ہی ہوتے ہیں — ایک جگہ پر تو پدماوت میں فارسی کا ایک فقرہ ہی اٹھا کر رکھ دیا گیا ہے ”سرتاپائی“ جو فارسی کا ”سرتاپا“ ہے۔

فارسی کی بس اتنی ہی جھلک کہیں کہیں دکھائی پڑتی ہے ورنہ شاعر جاسی کی زبان گویا سانچے میں ڈھلی ہوئی بہت ہی شیریں

اور دلکش ہو۔ شاہی دربار وغیرہ کے بیان میں ”اراکان“۔ ”بارگاہ“ ایسے کچھ لفظ آگئے ہیں لیکن وہ موضوع کے اعتبار سے زرا سابی نہیں کھٹکتے۔

شاعر جاسی کی زبان کی چاشنی اور اس کا سُرِ پلا پن نرالا ہو۔ اس میں برج بھاشا کی چاشنی ہو نہ کہ سنسکرت کی۔ اُس میں اودھی اپنی نج کی مٹھاس لیے ہوئے ہو۔ اگر اس کا اندازہ کرنا ہو کہ اودھی زبان کے بہتے ہوئے شیریں اور شفاف چشمے تک شاعر جاسی کی کتنی پہنچ ہو تو پدماوت کی نزاکت تخیل، روانی، سلاست اور فصاحت کا مطالعہ ناگزیر سا ہو گا اس لیے کہ بقول مصنف جاسی گرنٹھاولی، اودھی کی خالص بے میل مٹھاس کے لیے پدماوت کا نام برابر لیا جائے گا۔

سن تصنیف | نظم پدماوت پر نقد و تبصرہ سے قبل اُس کا سن تصنیف معلوم کر لینا بوجہ مناسب ہو گا سر جارج گریئر سن نے اس کا سن تصنیف ۱۵۴۰ء لکھا ہے جو ۹۲۶ھ ہجری کے مطابق ہے ہندی کے بیشتر ادیب بھی پدماوت کا سن تصنیف ۹۲۶ھ ہجری بتاتے ہیں اور پدماوت کے اس صدی کے نسخوں میں بھی تصنیف کا سن یہی ۹۲۶ھ ہجری ملتا ہے۔ نظم پدماوت میں شیر شاہ کی مدح اس کے زمانے کی سڑکوں کے تذکرے اور ”راجا بادشاہ کھنڈ“ میں فرنگیوں کے ذکر کی بنا پر یہی سن تصنیف کا صحیح سمجھا جاسکتا ہے۔

تاہم اس کی صحت میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پداوت ۹۲۷ھ ہجری میں لکھی گئی۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کی ابتدا ۹۲۷ھ ہجری قرار دیتے ہیں اور ۹۲۹ھ ہجری کو سن تکمیل بتاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اس نظم میں گویا بائیس سال صرف ہوتے ہیں۔ یہ حضرات نظم پداوت میں شیر شاہ کی مدح اور سن تصنیف کی چو پائیوں کے درمیان چھو چو پائیوں کا فصل ہونے کی وجہ سے جن میں۔ مدح پیر، ذاتی حال، دوستیوں اور جاس کی تعریف و توصیف لکھی ہے، یہ استدلال بھی کرتے ہیں کہ مدح سرائی اور سن تصنیف میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ مدح کی چو پائیاں تکمیل نظم پر ۹۲۹ھ ہجری میں اضافہ کر دی گئی تھیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک صفا نے شیر شاہ کو لفظ "سلطان" سے مخاطب کیا ہے اور چونکہ وہ ۹۲۹ھ ہجری میں دہلی کا "سلطان" ہوا تھا نہ کہ ۹۲۷ھ ہجری میں اس لیے اختتام کا سن ۹۲۹ھ ہجری ہے نہ کہ کوئی دوسرا سال اور نظم کے پُرانے نسخوں میں بھی تصنیف کا سال ۹۲۷ھ ہجری ہی ملتا ہے۔

سن تصنیف پر محاکمہ | پداوت ایک معرکہ آرا تصنیف ہے لیکن اس میں شاعر کی زندگی کے

حاشیہ صفحہ ۱۹۰

جمشیدی رومی اور فرنگی بڑ بڑ گئی اور سست گئی

اس شعر میں پرتگالیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی طرف اشارہ ہے پرتگالیوں کا دور ۱۵۳۷ء مطابق ۹۲۵ھ کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے یعنی ۹۲۷ھ کے ۱۷۰ حاشیہ صفحہ ۱۹۲ پر ملاحظہ فرمائیے بہت بعد۔

بائیس سال صرف ہوئے ہوں قرین قیاس نہیں ممکن ہر اتنا وقت صرف ہوا ہو لیکن کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس مدت کا شمار ۹۲۷ھ ہجری ہی سے کیا جائے یہ مدت ۹۲۷ھ ہجری سے بھی شروع ہو سکتی ہے۔

ثنوی کی مروجہ رسم کے خلاف ابتدا میں بادشاہ وقت کا ذکر نہ کرنا اور اس کے تذکرے کو بعد کے لیے اٹھار کھنے کی کوئی وجہ نہ بتانا اس رواج سے لاعلمی کا ثبوت ہے۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا کسی دنیاوی لالچ سے یا کسی اور طمع سے، چند چوپائیوں کا فضل یا پرانے نسخوں میں ۹۲۷ھ ہجری کا ہونا بھی کوئی قطعی دلیل پدماوت کے سن تصنیف کو ۹۲۷ھ ہجری قرار دینے کی نہیں ہو سکتی نہ اس فصل سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مدح بعد میں ”جوڑ دی“ گئی ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ ملک صاحب کی ایک دوسری تصنیف یعنی ”آخری کلام“ میں مدح اور سن تصنیف کے درمیان بھی چار چوپائیوں کا فضل ہو اور سن تصنیف عہد بابر شاہ سے جس کی اس نظم میں مدح سرائی حسب رواج کی گئی ہے مطابقت کرتا ہو۔ اس سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ اگر ۹۲۷ھ میں

حاشیہ صفحہ ۱۹۱

اراکان کے راجہ کی سرپرستی میں پدماوت کا جو نسخہ تصنیف کے سو برس بعد بنگالی زبان میں ترجمہ ہوا ہے اس میں سن تصنیف ۹۲۷ھ درج ہے۔
۱۔ آخری کلام کا سن تصنیف ۹۳۶ھ ہے اسی طرح ہنس جواہر بھا کا مصنف میر قاسم کا سن تصنیف بھی ممدوح نظم محمد شاہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

پدماوت نظم کی گئی ہوتی تو پدماوت میں ابراہیم لودی کی مدح ملتی نہ کہ شیرشاہ کی۔

یہ درست ہے کہ ۹۴۷ھ میں شیرشاہ دہلی کا سلطان نہ ہوا تھا لیکن یہ امر مسلم ہے کہ وہ اس سے قبل ۹۴۷ھ میں ہمایوں کو شکست دے چکا تھا اور دہلی کا لے لینا چند روز کی بات تھی۔ اس کے علاوہ تخت نشینی کی رسم دسمبر ۱۵۳۹ء میں غوریا گور کے مقام پر ادا بھی ہو چکی تھی۔ جس طرح حسین میاں کو قطبین نے حسین شاہ لکھ دیا ممکن ہو اسی طرح شاعر جاسی نے شیرخاں کو دلی کا سلطان بنا دیا۔ پدماوت کی ترنگ میں اتنا مبالغہ ناراوا نہیں سمجھا جاتا اور پھر شہرت انسان کے پیش پیش چلتی ہے۔ کیا تعجب کہ تخت نشینی کی رسم کے ادا ہونے اور شیرشاہ کی دلی کی روانگی اور اس کی فتح یابی کی خبر خود شیرشاہ کے دہلی پہنچنے سے قبل ہی شاعر جاسی تک پہنچ گئی ہو۔

قصہ کو تاہ نظم پدماوت ۹۴۷ھ میں شروع کی گئی اور اسی وقت مدح بھی لکھی گئی ممکن ہے کہ ختم ہوئی ہو ۹۴۹ھ میں اور اس وقت ملک صاحب نے خود جا کر شیرشاہ کی خدمت میں پیش کیا ہو جیسا کہ مشہور ہے کہ ۹۴۹ھ میں وہ دربار میں گئے تھے۔

۱۔ شیرشاہ نے ہمایوں کو ۱۰ محرم ۹۴۷ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۵۳۰ء میں شکست دی۔ ہمایوں کا پیچھا کیا۔ وہ کچھ دن آگرے میں رہا پھر دلی گیا۔ اس کے بعد جب ہمایوں نے دلی چھوڑی تو ۱۵۳۲ء میں شیرشاہ دہلی کا سلطان ہوا۔
۲۔ ”شیرشاہ“ مصنفہ قانون گو صفحہ ۲۰۸

رسم الخط | ہندی کے متعدد ادیبوں کی رائے ہو کہ پداوت اور ملک صاحب کی دوسری تصانیف کا رسم الخط فارسی تھا۔ سر جارج گری یسن، اوجھاجی اور بابو شیا م سندر وغیرہ نے پداوت کے رسم الخط کو فارسی ہی قرار دیا ہے۔ اور اسی سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ ملک صاحب کی تصانیف فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھیں اس لئے اُن سے اس عہد کی زبان، بول چال اور تلفظ کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ ملک صاحب نے اُس رواج کی پروا نہیں کی جو قدامت پسند ۱۷۰۰ء سے چالیس برس قبل سر جارج گری یسن نے پداوت کے رسم الخط کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”سولہویں صدی کے ادیبوں میں تصنیف ہوتی۔ اس میں ہم کو اُس زمانے کی زبان اور تلفظ کا پتا لگتا ہے۔ ہندو مصنف قدامت پرستی کی وجہ سے اپنے الفاظ کے ہجا پرانے سنسکرت کے طریق کے مطابق کرتے تھے لیکن ملک محمد نے اس کا اتباع نہیں کیا“ یہی رائے سر جارج نے سدھا کر چندریکا کے دیباچے میں لکھی ہے۔

۱۷۰۰ء اوجھاجی پداوت کے سنہ تصنیف کو ۱۷۲۷ء قرار دینے والوں کے قول کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”جانشی نے پداوت ہندی میں لکھی یا اردو میں ٹھیک معلوم نہیں لیکن ۱۷۲۷ء کا ۱۷۰۰ء ہو جانا ہی بتاتا ہے کہ یہ اختلاف اردو رسم الخط ہی کے سبب سے ہوا ہوگا“

”آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس کا رسم الخط ہندی ہوتا تو ہم کی جگہ ۲ پڑھا جانا قریب قریب ناممکن تھا“

ہندوؤں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اِلا کے معاملے میں تلفظ کا خیال نہ کریں بلکہ اپنے آباد اجداد کا اتباع کرتے ہوئے الفاظ کو اسی طرح لکھیں جیسا کہ وہ سنسکرت میں لکھے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں تلفظ کو رواج دیا نہ کہ مستعمل اِلا کو۔

لالہ سیتارام نے بھی اپنے ایک مضمون میں جو آلہ آباد اسٹڈیز (ربابت ۱۹۳۰ء) میں شائع ہوا ہے سر جارج گری یرسن کی تائید کرتے ہوئے منظومات ملک خصوصاً پدمات کے رسم الخط کو فارسی ہی قرار دیا ہے۔ لیکن بالکل حال میں سن تصنیف کی طرح رسم الخط کے متعلق بھی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور ایک علمی بحث کا دروازہ کھل گیا ہے کہ آیا شاعر جاسی کی تصانیف کا رسم الخط فارسی تھا یا ہندی۔ چنانچہ پدمات کے رسم الخط کو ہندی قرار دینے کے لیے توجیہا ایک بہت چھوٹی بات یہ کہی جاتی ہے کہ "مسلمان اہل قلم خصوصاً صوفیوں کا مقصد اپنے اصولوں کو ہندوؤں کے کانوں تک پہنچانا تھا اور غالباً ملک محمد جاسی کا بھی یہی مقصد رہا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے پدمات کو ہندی رسم الخط میں لکھا ہوگا نہ کہ فارسی رسم الخط میں، خاص کر اس وقت جبکہ اُردو کا لوگ نام بھی نہ جانتے تھے۔" پھر یہ دیکھ کر کہ پدمات کے جتنے نسخے ہندی رسم الخط میں ملتے ہیں وہ فارسی رسم الخط ہی سے نقل ہوئے ہیں یہ حضرات فرماتے ہیں کہ "بعد کو ان نظموں کو مسلمانوں نے اُردو رسم الخط میں منتقل کر لیا۔ کہنے کو تو یہ حضرات یہ کہتے ہیں لیکن اُن کے قول کی تردید خود اُن کی دلیل سے ہوتی ہے۔ اُردو کا نام نہ جاننا اور بات ہر اور فارسی الخط سے ناواقفیت اور بات ہے۔ اس لیے اگر شیر شاہ کے

وقت میں لوگ اُردو کا نام بھی نہ جانتے تھے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ فارسی رسم الخط سے بھی بے بہرہ تھے۔

دوسرے یہ کہ ایسے زمانے میں جبکہ آج کی سی آسانیاں طباعت کی فراہم نہ ہوں نظم یا نثر کی کتاب کا دائرہ اشاعت محدود ہی ہوگا چاہے وہ کسی رسم الخط میں کیوں نہ لکھی گئی ہو۔ ایسے زمانے میں کسی کتاب کی مقبولیت ظاہر ہرگز کہ اسے دوسروں کو سنا کر ہی ہو سکتی تھی۔

اور یہ مشہور ہی ہے کہ ملک صاحب کے چیلے پدماوت کے دوہے پڑھ پڑھ کر لوگوں کو ملک صاحب کے کلام کی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔ پس پدماوت کے رسم الخط کے انتخاب میں کسی تبلیغی مقصد کو بھی دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اگر عتوڑی دیر کے لیے یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ملک صاحب کا مقصد ہندوؤں میں تصوف کے اصولوں کی تبلیغ ہی کرنا تھا تو ظاہر ہے کہ اس مقصد کا اولین نشانہ پڑھے لکھے ہندو ہی ہو سکتے تھے جن میں سے بیشتر فارسی پڑھ پڑھ کر دفاتر میں بڑے بڑے

عہدوں پر مامور تھے۔ ان کے استفادے کے لیے بھی رسم الخط کو ہندی کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی عہد شیر شاہ میں فارسی رسم الخط کے دفاتر میں رواج اور ہندوؤں کی فارسی دانی سے انکار کرنا اس عہد کی معاشرتی اور تمدنی تاریخ سے کھلی ہوئی چشم پوشی کرنا ہے۔ اب رہ گئے وہ کٹر مذہبی ہندو جو اٹلا میں آبا و اجداد کی حرف بہ حرف پیروی کرنا اپنا ”دھرم“ سمجھتے ہوں چاہے عام بول چال میں لفظ کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہو ان سے یہ امید کرنا کہ ملک صاحب کے کلام کو پڑھیں گے حسن ظن پر محمول کیا جاسکتا ہے پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں

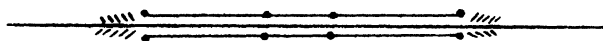
اسیما کہ محض ہندوؤں میں رواج دینے کے لیے رسم الخط کے انتخاب کے معاملے میں ملک صاحب نے مسلمان صوفیوں کی تعداد کو کیسے نظر انداز کر دیا ہوگا۔

تعجب بالائے تعجب یہ ہو کہ ہندو جن کے لیے خاص طور پر رسم الخط کی طرح ڈالی گئی ہو اور جن کے یہاں اب ایم۔ اے اور بی۔ اے کے درس میں پداوت شامل ہو وہ تو اس کی اتنی قدر کرتے رہے کہ اب اس کا ایک قدیم نسخہ تک اُن کے پاس ہندی رسم الخط میں محفوظ نہیں اور اردو داں طبقہ جن کی بیشتر فردیں ملک صاحب کی نظموں کے مطالب درکنار اُن کے الفاظ کو بھی نہ سمجھ سکتے ہوں وہ آج سے چند ہی سال قبل اپنی ادب نوازی کا یہ ثبوت دیں کہ ہندی رسم الخط سے پداوت کے سارے نسخوں کو اُردو میں اس طرح منتقل کریں کہ چند سال میں ہندی رسم الخط میں نقل کرنے کے لیے اردو رسم الخط میں لکھے ہوئے نسخوں کو اصل قرار دیا جائے۔ ایک اور دلیل ہندی رسم الخط کی تایید میں پیش کی جاتی ہے یعنی فارسی رسم الخط کے حروف تہجی (ALPHABETS) ہندی الفاظ کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے اس لیے ملک صاحب کی تصانیف کے لیے ان کا استعمال ناکافی ہے۔

ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حروف جو فارسی حروف تہجی میں نہیں ملتے اس رسم الخط میں کیونکر ادا ہوئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آج ”ڈ“ اور ”ٹ“ کو فارسی میں لکھنا چاہیں تو کس طرح لکھیں گے؟ جس طرح ان الفاظ کو فارسی رسم الخط میں

لکھا جاتا تھا اسی طرح ملک صاحب نے بھی پرمادوت میں ان الفاظ کو لکھا ہوگا۔

الغرض میری رائے میں ملک صاحب کی تصانیف کا رسم الخط فارسی تھا جیسا کہ ابتداءً جملہ منظومات کے اُردو رسم الخط میں دستیاب ہونے اور نیز ۹۳۷ھ کے ۹۲۷ھ ہو جانے سے بھی ظاہر ہے۔



سرپا

سنسکرت ادب میں ”نکھ سکھ“ (سرپا) کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ پدماوت میں پدمنی کا ”سرپا“ دو مقاموں پر آیا ہے۔ ایک جگہ ”توتے“ کی زبان سے دوسری جگہ ”راگھو“ کی زبانی تشبیہ کی نزاکت اور معنویت کے ساتھ ساتھ ہندی مذاق سلیم کا جو نمونہ ان دونوں سرپاؤں میں ملک صاحب نے پیش کیا ہے۔ اس کا اندازہ ”سرپا“ کے مطالعے ہی سے ہو سکتا۔ بھاکا کا شاعر اپنے سامنے کی تشبیہات کو استعمال کر کے کلام میں کتنی دل کشی اور دل فریبی پیدا کر دیتا ہے اس کا ثبوت ملک صاحب کا ”بارہ ماسہ“ اور ”سرپا“ ہیں جو نظم پدماوت کا ایک بہترین حصہ ہیں چونکہ ان دونوں ”نکھ سکھوں“ کے انداز بیان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اس لیے تمثیلاً ”توتے“ کا بیان کیا ہوا ”سرپا“ ترجمہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)

اُس کا سنگار اُسی کو پھبتا ہے پھر کوئی اس کی شرح کیا کرے۔
اس کے موئے مشکین کا تیج و خم (اس کی لہریں) سانپ کی طرح
بل کھاتا ہے اور اس کا رنگ بھونرے کے مانند ہے جب چوٹی
کھول کر بال جھاڑتی ہے تو سارا سنسار سیاہ ہو جاتا ہے۔ زہر آلود
گھونگھر والے بال زنجیرِ محبت بن کر کسی کے گلے پڑنا
چاہتے ہیں۔

(۲)

اُس کی بے سیند و بھری مانگ گویا اندھیری رین میں دیا
کی جوت ہو، یا کسوٹی پر سونے کی لکیر، یا گھنٹھور گھٹاؤں میں بجلی کی
چمک، یا آکاش پر سورج کی کرن، یا جمن میں سرستی۔ اور سیندور سے
بھری مانگ تو خون میں بھری ہوئی تلوار معلوم ہوتی ہو۔

(۳)

اس کی چمکدار پیشانی کو ہلال کی روشنی سے تشبیہ دینا غلط ہوگا
کہ اس میں اتنی روشنی کہاں۔ سورج اگر ہزار درجے روشن ہو تب
بھی اُس کی پیشانی کے نور کے مقابل نہیں ہوگا نہ کہ چاند جس میں عکس
کا عیب ہو اور اس کی جبین میں یہ عیب نہیں۔

(۴)

اس کی بھنویں مثل سیاہ کمان کے ہیں۔ جس طرف رخ کیا زہر
کے تیر بر سائے۔ یہی کمان کرشن کے پاس تھی یہی راگھو کے ہاتھ میں۔
اسی سے راون مارا گیا اور اسی سے کنس کی جان گئی۔ بھنویں کمان
اور عورت کمان دار ایسی دھنک کا کون مقابلہ کر سکے۔

(۵)

دونوں آنکھیں گویا بحرِ زخار ہیں۔ سُرخ کنوں سمجھ کر بھوزے
منڈلاتے ہیں جس طرف اٹھی بے لگام گھوڑے کے مانند جا پہنچی۔
اس کی گردش سے زمین آسمان سب ہل گئے۔

(۶)

پلکیں کیا ہیں گویا دو فوجیں آمنے سامنے تیر لیے کھڑی ہیں۔ ادھر

رام کی سینا اُدھر راون کی فوجوں کے بیچ میں آنکھ کا سمندر حایل۔ کون
ہر جوان تیروں کا کشتہ نہیں سارا عالم انھیں کا پامال کیا ہوا ہے۔

(۷)

اس کی ناک کو تلوار سے کیسے تشبیہ دوں۔ تلوار باریک ہوتی ہے
اور وہ مناسب طور پر باریک اور موٹی اس کی ناک دیکھ کر تو تاثر مند ہوا۔
توتے کی ناک سخت اور ٹیڑھی ہوتی ہے اور اس کی ناک نرم اور سُتواں۔
ہونٹ اور دانت کے قریب ناک ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا توتے کے
مُنہ میں انار کو دیکھ کر پانی بھرا ہوا ہے۔

(۸)

ہونٹ کیا ہیں آپ حیات کے کوزے ہیں۔ ان کا رنگ مثل
دوپہریا پھول کے ہے جب وہ بات کرتی ہے پھول جھرتے ہیں۔ ہیرا اُس کے
سامنے گرد ہے۔ جب وہ ہنستی ہے ایک عالم روشن ہو جاتا ہے۔ مُنہ سے پان
کا رنگ ٹپکتا ہے۔ دیکھیے یہ آپ حیات کسے نصیب ہو۔

(۹)

دانتوں کی تیبسی مثل ہیرے کے تھی اور بیچ بیچ میں مٹی کی دھڑی
جی تھی۔ جس طرح بھادوں کی اندھیری رات میں بجلی چمکتی ہے اُسی طرح
اس کے دانت چمکتے تھے۔ سورج، چاند، ستارے، جواہر لال اور مونگے
سب اس دانت کی روشنی سے روشن ہیں۔

جب بجلی باوصف اتنی روشنی کے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تو پھر
اور کون سی چیز اس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مسکراتے وقت دانت میں سے
ایسی چھوٹ پیدا ہوتی ہے جیسے سنگ سے شرار۔

(۱۰)

جب بات کرتی ہو زبان سے رس ٹپکتا ہو۔ اس کی آواز کے سامنے کوکلا، پیپہا اور بانسری سب بیچ ہیں۔ اس کی گفتگو شراب محبت سے بھری ہو جو سنتا ہو غش ہو جاتا ہو۔

(۱۱)

رُخسار کیا ہیں گویا ایک نارنگی کے دو ٹکڑے ہیں۔ باتیں رُخسار پر ایک تیل تھا جس سے لوگوں کے دل جلتے تھے۔ قطبیہ اُسے دیکھ کر انگشت بندناں ہو۔ کبھی نکلتا ہو کبھی ڈوبتا ہو لیکن تیل کو چھوڑ کر اپنی جگہ سے نہیں ملتا۔

(۱۲)

صدف گوش (کان) اس کے گویا دو چراغ ہیں کانوں کی بالیاں گویا دو بجلیاں چمک رہی ہیں جب وہ دوپٹہ ہٹاتی اور اوڑھتی ہو تو گویا بجلی چمک کر رہ جاتی ہو۔

(۱۳)

اس کی گردن ایسی معلوم ہوتی ہو جیسے کسی تار میں شیشی۔ طاؤس کی گردن اس کے مقابلے میں بیچ ہو۔ پھر نزاکت اتنی کہ پیک کی سُرخ تیک نمودار۔
دیکھیے یہ گردن کس کی بانہوں میں حایل ہو۔

(۱۴)

سونے کے رنگ کے اس کے بازو اور کلاسیاں۔ ایسی سڈول جیسے خردی ہوئی کسی کا دل نکال کر ہاتھوں میں لیا ہو جس سے انگلیاں

سُرخ ہیں۔ دنیا بے روح ہو۔ سارے سنسار کی آتما اس کے ہاتھ ہو۔

(۱۵)

سینہ تھالی ہو اور پستان لٹو۔ جس طرح بھورا اپنا ڈنک کیتی میں
ڈبوتا ہو اسی طرح پستان کے سرے چولیوں میں سوراخ کیے دیتے
ہیں۔ کندن کے بیل کی انگلیا سجا کر اس میں آب حیات کے دو کوڑے
بہ حفاظت رکھے ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ دوا آہنی تیر ہیں جو اگر اس طرح
بند نہ ہوں تو سنسار کو زخمی کریں۔ نیبو ایسی چھاتیوں کی چولی محافظ ہو۔
یہ نیبو دیکھیے کس کی قسمت کے ہیں۔

(۱۶)

پیٹ صندل کا سا خوشبودار اور زعفران کا سارنگ والا۔ دودھ
بھی اس کو گرانی کرتا تھا۔ صرف پھول اور پان پر رہتی تھی۔ سینے کے
بال کا سانپ ناف سے نکل کر پستان تک پہنچا وہاں موروں (یعنی سرپستان)
کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گیا ناف اس کی بنارس کا گرداب ہو جسے جان عزیز
نہ ہو وہ اس کے پاس جلتے۔ پیٹ کے بال ایسے معلوم ہوتے ہیں
جیسے بھوٹرے صندل کی خوشبو لینے کے لیے قطار در قطار جمع ہوتے ہیں۔
بہت سے گلا گھونٹ کر مر گئے مگر ایک کی بھی مراد نہ آئی۔

(۱۷)

چوٹی نے اس کی پیٹھ پر بڑی زیبائش پائی پیٹھ تختہ صندل اور
چوٹی سانپ، گویا سانپ لہریں مار رہا ہو اور دو پیٹھ مثل کیچی کے پڑا ہو
ممکن ہو صندل کی خوشبو لینے سانپ چڑھا ہو۔ زلف رخسار پر بل کیا
کھانی ہو گویا سانپ کنٹوں کے پھول کو منہ میں لیے ہو یا چاند کو

گہن لگ گیا ہے جو اقبال مند ہو وہی اس سانپ کو دیکھے۔ سانپ کنول کے پھول کو مُنہ میں لیے بیٹھا ہے جو اُسے دیکھے اُسے تخت و تاج نصیب ہے۔

(۱۸)

ایسی کمر کسی کی نہ ہوگی۔ چیتے کی کمر اس کے مقابل نہیں۔ زنبور (بھڑ) کو ایک عالم باریک کہتا ہے حالانکہ اس کی کمر اس سے کہیں باریک ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ غم و حسد سے زنبور زرد ہو گیا اور اب انسانوں کو ڈنک مارتا ہے۔ دل کے اشارے سے کمر کو موڑتی ہے۔ قدم اٹھا کر چلنے میں اندیشہ ہے ٹوٹ نہ جائے۔ شیر اس کی کمر کے مقابلے میں ہار گیا۔ اسی وجہ سے جنگل میں بھاگ گیا اور انسانوں کا خون اور گوشت اسی غصے میں کھاتا ہے۔

(۱۹)

گرداب ناف ابھی تک مانند غنچہ کنول کے ہے معلوم نہیں کس بھڑے کی قسمت میں ہے۔ صندل کے تختے پر ناف مثل سُم آہو کے ہے۔ دیکھیے اسے کون پائے (دوپٹے اس کے بدن پر ایسا تھا جیسے سمندر میں لہر)

(۲۰)

رانوں کی جوڑی ایسی جیسے خرا دے ہوئے ستون۔ اس کے پاؤں مثل کنول کے پھول کے سُرخ۔ اس کے قدم دیوتا ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ جہاں وہ قدم رکھتی ہے وہاں دیوتا سر رکھتے ہیں۔ ہو کوئی ایسا صاحبِ اقبال جس نے اس کے قدموں پر سر نہ رکھا ہو؟

ای حُسن کی دیوی!! حق تو یہ ہے کہ تیرے سراپا کا وصف مجھ سے ممکن ہی نہیں اس لیے کہ

ع۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

جائس

جائس اودھ کا ایک پُرانا اور تاریخی قصبہ ہے جو آج کل ضلع رائے بڑی میں ہے چونکہ بلندی پر واقع ہے اس لیے اس کی آبادی ایک حسین اور دلکش منظر پیش کرتی ہے۔

اولاً اس کا نام اودیا نگر تھا۔ اور یہ مقام ”بہر“ (راجپوت) قوم کا مستقر تھا۔ جب ۱۲۲۷ء میں سید سلا مسعود بعد غیاث الدین ہندستان آئے اور ان کے نایب نجم الملک سید نجم الدین نے اسے فتح کیا تب سے اس کا نام ”جائس“ پڑا۔

جائس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف دلچسپ روایتیں بیان کی جاتی ہیں:-

(۱) لشکر کا مستقر ہونے کے اعتبار سے مسلمان سپاہیوں نے ”جیش“ کہنا شروع کیا بعد کو ”جیس“ اور پھر جائس ہو گیا۔

(۲) سفر اور منازل کی صعوبتوں کے بعد جب اس قصبے میں اسلامی لشکر کو نسبتاً آرام اور سکون میسر ہوا تو اظہارِ پسندیدگی کے طور پر لشکر کا لشکر چلا اٹھا کہ ”جائے ایست“ یہی نعرہ مسرت بعد کو بگڑ کر جائس ہو گیا۔ گویا جائس نعرہ مسرت کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(۳) جائس صبیغہ اسم فاعل ہے۔ اس کا مصدر ہے ”الجوس والجوسان“ جس کے معنی ہیں دشمن کو رات کے وقت مارنا — چونکہ جائس شہنشاہ مار کر فتح ہوا تھا اس لیے اس کا نام جائس پڑ گیا۔

(۴) ایک روایت جاس کو جلے عیش کی بدلی ہوئی شکل بتاتی ہے۔ مذہبی اعتبار سے جاس ہمیشہ ممتاز رہا اب بھی اکثر عمارات ہر مذہب و ملت کی جاس میں ایسی ہیں جو مذہبی اعتبار سے کافی شہرت اور مقبولیت رکھتی ہیں جن میں سے ایک سید اشرف جہانگیر کی درگاہ بھی ہے۔ ان کے علاوہ وہ مقابر بھی ہیں جو فتح جاس سے متعلق ہیں اور جن کو اعتقاد دی نقطہ نظر سے عوام نے مذہبی یادگاروں کا سا مرتبہ دے رکھا ہے۔

فتح جاس کے قبل یہاں کی آبادی کس ڈھنگ پر تھی معلوم نہیں۔ البتہ مسلمانوں نے آبادی کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ان حصوں کا نام ان قبیلوں کے نام پر رکھا جو ان میں آباد ہوئے۔ انھیں حصوں میں سے ایک کا نام ”کچانہ“ ہے جو ملک صاحب کا مولد و مسکن ہے۔

اس سرزمین سے کتنے ہی علما، فقہا، حکما، شعرا، صناع، اہل سیف، اہل قلم، صوفی، رشی، مثنیٰ اٹھے اور اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا کر ایسے پیوند خاک ہوئے کہ آج تک گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں گو چند نامور فرزند جن سے جاس کی موم خیزی کا پتہ چلتا ہے اب بھی موجود ہیں لیکن امتداد زمانہ کے کرشموں کے ہاتھوں ان کا تحفظ بھی مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔

جاس کی زمین زرخیز، آب و ہوا خوشگوار اور آبادی کثیر تقریباً ۳۰۰۰ ہزار ہے۔ اس کے باغوں میں فواکھات کی فراوانی زمین کی زرخیزی کا پتہ دیتی ہے۔ اعلیٰ طبقے میں زیادہ تعداد مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کے اخلاف کی ہے جن کو قدامت پسندی نے مغلسی کی ضمانت

میں دے دیا ہے۔ ہندوؤں میں علاوہ کاستھوں اور معدودے چند
برہمنوں اور ٹھاکروں کے زیادہ آبادی شاگرد پیشہ لوگوں کی ہے۔ اس
دیارِ علم و عمل میں اب عموماً بے علمی اور بے عملی کا فرمانظر آتی ہے۔ صنعتیں
تباہ اور تجارتیں غارت ہو گئی ہیں۔ البتہ:-

از نقش و نگار درود یوار شکستہ آتار پدید است ضا دید عجم را



ہماری زبان
انجمن ترقی اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار
ہر مہینے کی پہلی اور سولہویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے
چند سالانہ ایک روپیہ فی پرچہ پانچ پیسے

اُردو

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے
اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص
انتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت
ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات پڑی
سکہ انگریزی (آٹھ پڑی سکہ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو پڑی سکہ عثمانیہ)

رسالہ سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے)
اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دالوں میں مقبول کیا جائے۔
دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں، یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں
ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان
میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات
میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ قیمت
سالانہ صرف پانچ پڑی سکہ انگریزی (چھ پڑی سکہ عثمانیہ)
خط و کتابت کا پتہ: معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

عام پسند سلسلہ

اُردو زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے بہت دنوں سے یہ ضروری خیال کیا جا رہا تھا کہ سلیس عبارت میں مفید اور دل چسپ کتابیں مختصر حجم اور کم قیمت کی بڑی تعداد میں شائع کی جائیں۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اسی ضرورت کے تحت عام پسند سلسلہ شروع کیا ہے اور اس سلسلے کی پہلی کتاب ہماری قومی زبان ہے جو اُردو کے ایک بڑے محسن اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر جناب ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو کی چند تقریروں اور تحریروں پر مشتمل ہے۔ اُمید ہے کہ یہ سلسلہ واقعی عام پسند ثابت ہوگا اور اُردو کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو کر رہے گی۔ قیمت ۸/-

ہمارا رسم الخط

از جناب عبدالقدوس صاحب ہاشمی
رسم الخط پر بحث کی گئی اور تحقیق و دلیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے اُردو رسم الخط مناسب ترین اور ضروری ہے۔
گیارہ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجیے۔

مینجر انجمن ترقی اُردو (ہند) علی دریا گنج۔ دہلی
(جند پرین دہلی)

